دارالاسلام (پٹھان کوٹ) کا تعلیمی منصوبہ
(ایک تحقیقی مطالعہ)

محمد ارشد*

جنوبی ایشیا میں غیر مسلم برطانوی اقتدار کے قیام و استحکام نے یوں تو ملّتِ اسلامیہ کی اجتماعی زندگی کے سبھی شعبوں خصوصاً فکری و اعتقادی، قانونی، عدالتی، اور تہذیبی و سماجی پر اثر ڈالا لیکن روایتی نظامِ تعلیم و تربیّت کو تو اس بیرونی اقتدار کے ہاتھوں شدید زک پہنچی اور اس کا تار و پود بکھر کر رہ گیا۔ مسیحی مبشّرین اور برطانوی حکام نے اس خطّے میں جو جدید نظامِ تعلیم رائج کیا وہ مسیحیت اور مغربی تہذیب و افکار کی اشاعت کا ایک نہایت طاقت ور وسیلہ بن گیا(۱) مسیحی مبشّرین کی تبلیغی مساعی اور ان کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کی مسموم فضا کے زیر اثر بعض مسلم افراد کے اپنے قدیم مذہب سے برگشتہ ہو کر حلقہ بگوش مسیحیت ہو جانے کے واقعات بھی رونما ہوئے۔(۲)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد تو مسلم تہذیب و معاشرت کی بقا کو شدید خطرات لاحق ہو گئے۔ اس نازک دور میں مسلمانوں میں، دینی و سیاسی اور تعلیمی امور و مسائل میں ان کی راہنمائی کے لیے، دو قسم کی قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ پہلی قیادت دینی قیادت تھی جس کے علمبردار روایتی علمائے دین تھے، جبکہ دوسری قیادت کے علمبردار سیّد احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸) اور ان کے جدید الخیال رفقاء تھے۔ ان دونوں قیادتوں نے نوخیز نسل کی تعلیم و تربیت کے لیے زبردست تعلیمی تحریکیں برپا کیں اور درس گاہیں قائم کیں۔

علماء نے عیسائیت کی ترویج و اشاعت میں حکومت کی سرگرمی و گرمجوشی اور مغربی تہذیب کی مسلم عوام میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ مقبولیت اور مسلمانوں کے عقائد اور اخلاق و معاشرت میں اس کے اثرات کی وجہ سے اس امر کی فکر شروع کی کہ اسلامی زندگی کے مظاہر اور اسلامی تہذیب و معاشرت کے بچے کھچے آثار کے تحفظ کی کوشش کی جائے اور اس غرض سے عربی مدارس قائم کر کے وہاں داعی و مبلّغ تیار کیے جائیں۔ اس تعلیمی تحریک کے، جس کا آغاز ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶٦ میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے ہوا، سربراہ بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ/ ۱۸۳۲-۱۸۸۰ء) تھے۔ اس تعلیمی تحریک نے جدید مغربی تہذیب و معاشرت خصوصاً مغربی علوم اور زبانوں کے بارے مقاطعے کی روش اختیار کی۔(۳) چنانچہ دارالعلوم دیوبند نے خود کو صرف روایتی دینی علوم کی قدیم طریقہ پر

* مدیر، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

تعلیم و تدریس تک محدود رکھا۔(۴)

علماء کے مقابلے میں سرسیّد احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۷ء) نے مسلمانوں میں انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم کی اشاعت کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیا اور اس غرض سے ایک زبردست تعلیمی تحریک (تحریکِ علی گڑھ) برپا کی اور مختلف شہروں میں جدید طرز کے مدارس جبکہ علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا۔ سرسیّد احمد خان نے مسلم قوم کو جدید علوم اور انگریزی زبان کی تحصیل کے ساتھ ساتھ حاکم قوم کی تہذیب و طرز معاشرت اور عادات و اطوار کی تقلید و نقالی کی دعوت بڑے جوش و جذبے سے دی۔(۵)

سرسیّد کے دور میں اور اُن کے بعد بھی انگریزی اسٹاف کو پالیسی سازی کے علاوہ کالج کی نصابی اور غیرنصابی سرگرمیوں میں مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ انگریزی اسٹاف نے طلبا کو انگریزی زبان و ادب کے علاوہ مغربی تہذیب و معاشرت اور افکار و خیالات کا شیفتہ و دلدادہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔(۶) چنانچہ اس دور میں طلباء کا طرزِ فکر خالصتاً مغربی ہوگیا۔ وہ اسلامی و مغربی تہذیبی و معاشرتی اقدار کے بارے میں اجنبیّت جبکہ خود اسلامی عقائد و تعلیمات کے بارے میں تشکیک و ارتیاب میں مبتلا ہوئے۔ سرسیّد احمد خان کے طرزِ فکر و عمل اور اس کے اثرات و نتائج کے بارے میں سیّد ابوالحسن علی ندوی کا یہ تبصرہ بڑا موزوں اور برمحل معلوم ہوتا ہے:

> ''انھوں (سرسیّد احمد خان) نے نظامِ تعلیم کو مغرب سے اُس کی ساری تفصیلات، خصوصیات، اُس کی رُوح و مزاج اور اُس ماحول و روایات کے ساتھ جو اُس سے وابستہ تھیں۔ جوں کا توں برآمد کیا۔ انہوں نے صرف مغرب کے تعلیمی نظام ہی پر اصرار نہیں کیا بلکہ مغربی تمدّن اور روح کے قبول کرنے پر بھی شدید اصرار کیا۔ کالج کے بڑے اساتذہ میں سے کم از کم چار پانچ ضرور انگریز ہوتے تھے، جو مختلف شعبوں میں منتظم و نگرانی کے فرائض انجام دیتے تھے، کالج کے نظام اور طلبا کے اخلاق پر اُن کا گہرا اثر تھا۔ غرضیکہ سرسیّد کی دعوت اور تعلیمی نظریہ مغربی تہذیب کی تقلید و نقالی کی دعوت کے ساتھ لازم و ملزوم ہوگیا۔ ان اثرات اور مغربی ماحول کی وجہ سے جو کالج پر چھایا ہوا تھا ایک ایسی اسلامی نسل پیدا ہوئی جو نام کے لحاظ سے مسلمان اور ذہن و دماغ کے لحاظ سے خالص مغربی تھی، معاشرت و تمدّن میں انگریزی طور و طریق کی پابند اور حامی جبکہ عقائد میں کمزور اور متزلزل۔''(۷)

غرضیکہ ملّتِ اسلامیہ کا بڑا حصہ ان دونوں تعلیمی تحریکوں اور قیادتوں کے درمیان ہچکولے کھاتا رہا، جس میں سے ایک قدیم طرزِ تعلیم اور مسلک سے سرِمُو انحراف ایک قسم کی تحریف اور بدعت گردانتی تھی جبکہ دوسری تحریک

مغرب سے آنے والی ہر چیز کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اس کو ہر عیب اور نقص سے پاک سمجھتی تھی جہاں تک کہ اہلِ مغرب کے افکار اور فکری رجحانات بھی اس کو عظمت و عصمت کا پیکر نظر آتے تھے اور اس کو وہ ذہن انسانی کی پرواز کی آخری منزل تصوّر کرتی تھی۔(۸)

تحریکِ ندوۃ العلماء: قدیم و جدید کے امتزاج کی علمبردار

انیسویں صدی کے اواخر میں قدیم روایتی طرزِ تعلیم میں اصلاح کی غرض سے ندوۃ العلماء کے نام سے ایک نئی تعلیمی تحریک منظر عام پر آئی (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء)۔ ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد میں رفع نزاعِ باہمی (علماء کے مذہبی وفقہی نزاعات و اختلافات کا رفع کرنا)، اسلام کی تبلیغ و اشاعت، مسیحی مبشرین و مستشرقین کے اعتراضات کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت و مدافعت اور اصلاحِ نصاب وطریقۂ تعلیم کو خاص اہمیت دی گئی۔(۹) بانیانِ ندوۃ العلماء نے بلند و بانگ دعاوی کے ساتھ مدارس کے قدیم نظام و نصابِ تعلیم میں اصلاح و ترمیم اور قدیم و جدید میں امتزاج کا غلغلہ بلند کیا اور اس غرض سے ایک دارالعلوم -- دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ-- کے نام سے قائم کیا۔(۱۰) بقول علامہ شبلی نعمانی ''دارالعلوم ندوۃ العلماء اس غرض سے قائم کیا گیا کہ اس میں علوم دینوی اور علوم دینی کی تعلیم ایک ساتھ دی جائے اور اس سے ایسے روشن خیال علماء پیدا ہوں جو دونوں قسم کے علوم کے جامع ہوں اور وہ جدید اور قدیم گروہوں کے درمیان رابطہ اتحاد کا کام دیں اور اسلام کا وہ مکمل نقشہ ان کے پیش نظر ہو جس میں دین اور دنیا دونوں جمع کیے گئے ہوں۔''(۱۱)

بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری (۱۲۶۲-۱۳۴۶ھ/۱۸۴۶-۱۹۲۷ء) نے دارالعلوم کے لیے جو نصاب مرتب کیا اس میں جدید فلسفہ، جدید ہئیت اور جدید تاریخ کی تعلیم و تدریس کی ضرورت کو پیش نظر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جن علوم کی اہمیت اس زمانہ میں بہت بڑھ گئی ہے۔ ان کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ مثلاً جدید علم کلام، ریاضی، اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ، منطق و فلسفہ، قدیم کے بڑے حصہ کو ترک کیا جائے اور صرف اس کے مفید اور ضروری اجزاء پر اکتفا کیا جائے۔ قرآن و حدیث اور فقہ کی طرف توجہ دی جائے۔(۱۲) مولانا محمد علی مونگیری نے جدید علم کلام کی تدوین اور فلسفہ جدید کے ردّ نیز دعوت و تبلیغ کے لیے طلباء علوم دینیہ کے لیے انگریزی زبان کا سیکھنا بھی ضرور قرار دیا۔ مولانا کے الفاظ میں:

> ''فلسفۂ جدید کا ردّ کرنے کے لیے زبان انگریزی کا جاننا بھی ضروری ہے کیونکہ یہ فلسفہ زبان انگریزی میں ہے اور ترجمہ کرا کے اس کا جواب دینا جیسا کہ ابتدائے اسلام میں فلسفۂ یونانی کے ساتھ کیا گیا، کافی نہیں ہوسکتا۔''(۱۳)

مولانا سید محمد علی مونگیری کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ ہمارے طلباء اور علماء جن کے ہاتھ میں امت کی زمام قیادت ہے انگریزی زبان اور جدید علوم سے بہرہ مند ہوں اور اس کو اسلام کی ترجمانی کا ذریعہ بنائیں اور نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے مغرب زدطبقہ پر اثر انداز ہوں بلکہ یورپ میں جا کر اسلام کا پیغام پھیلائیں۔(۱۴)

ان اعلیٰ و ارفع اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے ستمبر ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کا عملی افتتاح ہوا اور اُس کے ابتدائی درجات کھل گئے۔ تاہم اصلاحِ نصاب و طریقۂ تعلیم سے متعلق ندوۃ العلماء کے بانیوں کے بلندعزائم کے باوجود اس دارالعلوم کا نصاب دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔(۱۵)

> ''دیوبندی نظام و نصاب تعلیم جو درسِ نظامی پر مبنی تھا اور ندوی نظام و نصاب تعلیم کے درمیان نصاب تعلیم کا اختلاف اصولی نہیں، جزئی نوعیت کا تھا۔''(۱۶)

البتہ اس کے نصاب عربی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس پر خاص توجہ گئی۔ مزید برآں تاریخ اور جغرافیہ کے علاوہ انگریزی زبان کو بھی نصاب کا حصہ بنایا گیا۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۲ء میں ''سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے انگریزی کا ایک کلاس کھول دیا گیا اور اس مقصد کے لیے انگریزی کے ایک مدرّس کا تقرر بھی عمل میں آ گیا۔''(۱۷) تاہم ندوۃ العلماء کے ایک ممتاز اور سربرآوردہ رکن مولانا شبلی نعمانی(۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) اس امر کے زبردست داعی و حامی تھے کہ نصابات میں انگریزی زبان اور جدید علوم بھی شامل کیے جائیں، تاکہ ایسے داعی اور مبلغ تیار ہوسکیں جو مسیحی مبشرین و مستشرقین کے اعتراضات کا ردّ کرسکیں اور مغرب کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت مؤثر طور پر پہنچاسکیں۔مولانا شبلی نے خاص اس غرض سے دارالعلوم میں انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس کی پُرزور حمایت کی تھی۔(۱۸) انھوں نے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۰ء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''عربی قدیم مدارس کا حال یہ ہے کہ نہ ان میں انگریزی زبان کی تعلیم ہوتی ہے اور نہ جدید علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں نہ نئے خیالات سے ان کو واقف کرایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تعلیم یافتہ جدید تعلیم یافتہ افراد کے خیالات پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خیالات سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ندوۃ العلماء کا دارالعلوم درحقیقت ایک ''جامعہ دینیہ'' یعنی ایک مذہبی یونیورسٹی کا سنگ بنیاد ہے۔ آج مسلمانوں کو سب سے زیادہ ایک ایسی مذہبی یونیورسٹی کی ضرورت ہے۔ جس میں اسلامی علوم اعلیٰ درجے تک پڑھائے جائیں، جس میں یورپین علوم وفنون کی تعلیم کا کافی بندوبست کیا جائے، جو جدید علم کلام پیدا کر سکے، جس کے تعلیم یافتہ انگریزی زبان میں وعظ اور مذہبی لیکچر دے سکیں، اس قسم کی یونیورسٹی

کی ضرورت اور اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔'' (۱۹)

مولانا شبلی بڑی قوت و طاقت سے کہتے تھے کہ

''مذہبی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کی ضرورت ہے۔ موجودہ فلسفہ کا مقابلہ علوم جدیدہ کی واقفیت کے بغیر کیونکر ہوسکتا ہے؟ یورپ میں اسلام کی اشاعت انگریزی دانی کے بغیر کیونکر ہوسکتی ہے؟ آریوں اور عیسائیوں کے مذہبی حملوں کا علم انگریزی دانی کے بغیر کیسے ہوسکتا ہے؟'' (۲۰)

مولانا شبلی کی رائے تھی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تمام طلبہ کے لیے انگریزی لازمی کی جائے۔ انہوں نے سید سلیمان ندوی کے ایک سوال کہ ''آپ مدرسہ میں انگریزی کو کیوں لازم قرار دیتے ہیں؟'' کے جواب میں فرمایا:

''نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلیٰ مسلمان خاندانوں سے مٹتی جاتی ہے۔ اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزی کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا۔ اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی۔ اب بھی دیکھو جب غیر مذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک کے سمجھنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ اپنی اس پیاس کو سیل [G. Sale] کے انگریزی ترجمہ سے بجھاتے ہیں۔ فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمہ پر رہ گیا ہے۔ کیا یہ کام ہمارے علماء کا نہیں؟'' (۲۱)

مولانا شبلی کہتے تھے کہ ''اگر فقہاء انگریزی جانتے ہوتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کرسکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیرمسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند قرار نہ پاتے۔'' (۲۲) مولانا شبلی کی رائے تھی کہ ''ایسے علماء جو موجودہ زمانے میں اپنے علمی وقار کو قائم رکھ سکیں، معترضینِ اسلام کے جوابات دے سکیں اور نئے تعلیم یافتوں کی تشفی کرسکیں بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ انگریزی زبان سے تھوڑی واقفیت رکھیں۔'' (۲۳)

آخر کار مولانا شبلی کے اصرار پر ۱۹۰۳ء میں انگریزی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے شریکِ نصاب کی گئی۔ (۲۴) آخر ربیع الاوّل ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں پندرہ روپے ماہوار پر ایک انگریزی کا استاد مقرر ہوگیا اور کچھ طالب علموں نے اے بی سی ڈی پڑھنا شروع کی مگر یہ تعلیم دقع الوقتی سے زیادہ نہ تھی۔ سالہا سال کے بعد بھی کوئی پرائمری سے آگے نہیں بڑھا۔ مولانا شبلی چند سال بعد ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کے معتمدِ تعلیمات ہوئے تو اُن کے

اصرار سے ہرلڑکے کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔(۲۵) انگریزی کی یہ تعلیم اتنی تھی کہ طالب علموں میں میٹرک تک کی لیاقت پیدا ہوجائے۔مولانا شبلی کا خیال تھا کہ ۸ برس کی عربی تعلیم کے بعد دو برس خاص انگریزی تعلیم کے لیے انگریزی کا ایک درجۂ تکمیل کھولا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ جب طلبہ درجۂ تکمیل میں دو برس تک اورصرف انگریزی پڑھیں گے تو زبان دانی میں قابل گریجوایٹوں کی برابری کرسکیں گے اور اس وقت انگریزی میں تبلیغِ اسلام کی خدمت انجام دے سکیں گے۔(۲۶) مگر یہ درجہ دارالعلوم میں قائم نہ ہوسکا۔ افسوس کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قدیم وجدید کی یکجائی اور امتزاج کا مقصد بھی حاصل نہ ہوسکا۔ دارالعلوم میں انگریزی کا جو نصاب رائج کیا گیا وہ اس قدر معمولی تھا کہ اس سے طلباء میں اتنی استعداد ہرگز پیدا نہ ہوسکتی تھی کہ وہ انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف اور دعوت وتبلیغ کا وظیفہ بجا لاتے۔ بالفاظِ محمد مجیب (سابق شیخ الجامعہ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ- نئی دہلی)۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بانیوں کا یہ خیال کہ انگریزی زبان، تاریخ اور جغرافیہ کا معمولی علم طلباء میں فلسفہ جدید کے ردّ اور مستشرقین کے اعتراضات کے جواب اور مغرب میں دعوت تبلیغ اسلام کی صلاحیت پیدا کردے گا، درست نہ تھا۔''(۲۷)

غرضیکہ بانیانِ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے یہ اجتہادی نوعیت کے اقدامات قدیم وجدید کی کشمکش کوختم کرکے ایک ایسا جامع ومتوازن نظام ونصابِ تعلیم کو جاری کرنے میں ناکام رہے کہ جس سے بہرہ مند ہونے والے افراد قدیم روایتی اسلامی علوم پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بھی آراستہ ہوتے، اور وہ ایک طرف جدید تعلیم یافتہ طبقے اور اہل مغرب کے سامنے اسلام کو مؤثر طور پر پیش کرنے کی صلاحیت واستعداد کے حامل ہوتے اور دوسری طرف ملّت اسلامیہ کو درپیش نت نئے مسائل کے لیے اجتہاد کو بروئے کار لاکر احکامِ اسلام کی تعبیرِ نو کا وظیفہ انجام دیتے۔(۲۸) بعض ناقدین کی رائے میں تو ''ندوۃ العلماء۔لکھنؤ'' فکر ونظر کا مرکز بننے کی بجائے صرف عربی زبان و ادب کا ایک گہوارہ اور تاریخ اسلامی کا ایک دارالاشاعت بن کر رہ گیا اور علی گڑھ کے جدید اور دیوبند کے قدیم مذہبی فکر کے مابین کوئی حقیقی اور واقعی امتزاج پیدا کرنے میں بالکل ناکام رہا۔''(۲۹)

ڈاکٹر محمد اقبال کا تصور اسلامی دارالعلوم/اسلامی یونیورسٹی

دریں صورت ملّت کا درد رکھنے والے کچھ اہلِ فکر ونظر ایسے بھی تھے، جو صرف قدیم روایتی اور جدید مغربی دونوں نظام ہائے تعلیم سے غیر مطمئن تھے۔ وہ ندوۃ العلماء کے تعلیمی تجربے سے بھی مطمئن نہ تھے اور ملّت کے دینی وملی تقاضوں کی تکمیل کے لیے نئے تعلیمی تجربے کے خواہاں تھے۔ اس گروہ کے سرخیل حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال تھے۔ ڈاکٹر محمد اقبال محسوس کرتے تھے کہ قدیم روایتی اور جدید مغربی دونوں نظامہائے تعلیم ملّت کے دینی و روحانی

مقاصد اور اس کے اجتماعی نصب العین سے مطابقت نہیں رکھتے۔ انھوں نے جدید مغربی تعلیم کی خامیوں اور عُیُوب و نقائص نیز اس نظام کے مسلمانوں کی نوخیز نسل کے قلب و ذہن پر مرتّب ہونے والے فاسد و منفی اثرات کی برملا طور پر نشان دہی کی۔(۳۰) وہ مغربی تعلیم کے فاسد اثرات کے ازالہ کی تدابیر سوچتے رہتے تھے۔ بطورِ خاص وہ عصرِ جدید میں اسلام کی تعبیرِ نو اور اجتہاد کی صلاحیت و استعداد سے بہرہ ور افراد کی تیاری کو ایک ناگزیر ملّی ضرورت گردانتے تھے۔ چنانچہ وہ اس غرض سے ایک اسلامی یونیورسٹی/ جدید اسلامی دارالعلوم کے قیام کو ضروری خیال کرتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ''ملّتِ بیضاء پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے اپنے خطبے میں انہوں نے فرمایا:

> ''اسلامی یونیورسٹی کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں ایک مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیّت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس قسم کے دارالعلم (دارالعلوم) کی ضرورت میں شک وشبہ کی مُطلق گنجائش نہیں رہتی۔ مسلمان کو بے شک علومِ جدیدہ کی تیز پا رفتار کے قدم بقدم چلنا چاہیے لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو اور یہ اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قوم کی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں۔

ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قیام ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیّت کا کام ایسے علماء اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے لیے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اُن کا مبلغ علم، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اُصول و فروع کی تلقین کے لیے موجودہ زمانے کے واعظ کو تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے ادب اور تخیل میں پوری طرح دسترس رکھنی چاہیے۔ الندوۃ، علی گڑھ کالج، مدرسۂ دیوبند اور اس قسم کے دوسرے مدارس، جو الگ الگ کام کر رہے ہیں اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کرسکتے۔ ان تمام بکھری ہوئی ضرورتوں کی شیرازہ بندی کے لیے ایک وسیع اغراض کا مرکزی دارالعلوم ہونا چاہیے، جہاں افرادِ قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو ونما دینے کا موقعہ حاصل کرسکیں، بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچا بھی تیار کیا جاسکے جس میں موجودہ زمانہ کے ہندوستانی مسلمان کا ڈھلنا ضروری ہے۔ پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلم (دارالعلوم) قائم کیا جائے جس کی مَسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب و دلکش انداز میں ہوتی ہو۔'' (۳۱)

دارالاسلام (جمال پور، پٹھان کوٹ) کا تعلیمی منصوبہ

جیسا کہ مذکورہ بالا بیان سے مترشح ہوتا ہے علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اس امر کے شدید طور پر آرزومند تھے کہ کوئی ایسا علمی مرکز قائم ہو جہاں دینی و دنیوی علوم کے ماہرین مجتمع ہوں اور جس میں فکرِ اسلامی (علم الکلام اور فقہ) کی تشکیل و تدوینِ جدید کے لیے اعلیٰ پائے کے ماہرین (متکلّمین اور فقہا) کی تعلیم و تربیت کا عمدہ و اعلیٰ انتظام ہو۔ جہاں دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے ایسے منتہی طلبا کو، جو جدید عمرانی و سائنسی علوم خصوصاً فلسفۂ و ریاضی کی طرف میلان رکھتے ہوں، تعلیم و تربیّت دی جائے تا کہ وہ اسلام کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کریں اور علمی طور پر اس کی حقانیت کو ثابت کریں۔(۳۲)، اور وہ علوم اسلامی کے متعلق ایسی کتابیں لکھیں جو عصر حاضر کی فکر میں انقلاب پیدا کردیں(۳۳) اس اہم ترین دینی و ملی وظیفہ کی بجا آوری کے لیے ایک علمی مرکز کے قیام سے متعلق علامہ کی اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کی ایک صورت، ان کی زندگی کے آخری سالوں میں چودھری نیاز علی خان کے تعلیمی منصوبے 'دارالاسلام' کی بدولت پیدا ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں جمال پور (پٹھان کوٹ، ضلع گورداس پور) کے ایک خوشحال زمیندار چودھری نیاز علی خان (۱۸۸۰-۱۹۷۶ء) نے، جو خدمت دین اور اصلاح ملت کا جذبہ وافر رکھتے تھے۔(۳۴) پٹھان کوٹ سے چندمیل کے فاصلے پر قصبہ جمال پور میں روایتی و جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور عامۃ النّاس کی دینی تعلیم کے لیے ایک ایسے ادارے کے قیام کی تحریک شروع کی کہ یہاں قابل اور صاحب بصیرت علماء علوم مشرقی اور علوم مغربی کے منتہی اشخاص کو قرآن شریف پڑھائیں اور ان کے مطالعہ قرآن مجید میں ہدایت و رہنمائی کریں۔ ساتھ ہی وہ قرآن مجید کی بصیرت کی روشنی میں مسائل و معاملات حاضرہ پر تصنیف و تحقیق کا کام بھی انجام دیں اور وقتاً فوقتاً اپنی تحریرات کے ذریعے اپنی آرا کا اظہار فرماتے رہیں۔(۳۵)

نیاز علی خان نے مجوزہ ادارے کے قیام اور انتظام و انصرام کے سلسلے میں رہنمائی و مشاورت کی غرض سے برِّعظیم پاک و ہند کے سربرآوردہ اصحاب علم و نظر سے مراسلت شروع کی، جن میں سے ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا محمد اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳-۱۹۴۳ء)، علامہ سیّد سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء)، مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) کے علاوہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) اور آسٹرین نومسلم محمد اسد (۱۹۰۰-۱۹۹۲ء) بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔(۳۶) نیاز علی خاں کا خیال تھا کہ کوئی بزرگ اور صوفی منش عالم دین اس کے منصرم مقرر ہوں۔ جو اپنے عقائد مسلمات کے لحاظ سے تو متقدمین میں سے ہو مگر حالات حاضرہ پر اسے قابو ہو۔ اس غرض سے انہوں نے دارالعلوم دیو بند کے سر برآوردہ عالم مولانا اشرف علی تھانوی سے رجوع کیا۔ مولانا محمد اشرف علی تھانوی نے اس ادارہ کے لیے بطور شیخ کسی اور عالم دین کا نام تجویز کیا جو اس وقت رنگون اور سہارن پور کے مدارس میں تعلیم و تدریس

میں مشغول تھے اور وہ ان مدارس کو چھوڑ نا نہیں چاہتے تھے۔(۳۷) نیاز علی خان نے بطور خاص مؤخر الذّکر چاروں اصحاب کو دعوت دی تھی کہ وہ جمال پور- پٹھان کوٹ تشریف لاکر مجوّزہ ادارے کی زمامِ کار سنبھالیں اور تعلیم و تربیت کے منصوبے کو اپنی نگرانی و رہنمائی میں عملی جامہ پہنائیں۔سیّد سلیمان ندوی نے اپنی گوناں گوں دینی و علمی، تعلیمی و سیاسی اور تصنیفی و تالیفی ذمّہ داریوں اور مشاغل___ سیّد صاحب اُس وقت دارالمصنّفین،اعظم گڑھ کی نظامت کے علاوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمدِ تعلیمات جیسی اہم ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے تھے___ کے سبب نیاز علی خان کے تعلیمی منصوبے کی نگرانی و رہنمائی سے معذوری کا اظہار کیا۔اس پر نیاز علی خاں نے سیّد صاحب سے، مجوزہ ادارے کے لیے ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے کسی فاضل یا کسی رفیق دارالمصنّفین کی خدمات مانگیں اور کسی ایسے عالم دین کا نام تجویز کرنے کے لیے لکھا، جسے ادارے کی تولیّت سونپی جاسکے۔اس پر سیّد صاحب نے جو جوابی خط (محرّرہ ۳۰ جولائی ۱۹۳۵ء از حیدرآباد دکن) ارسال کیا وہ ملاحظہ ہو:

مکرمی- السّلام علیکم

والا نامہ ملا۔ میں ابھی تک یہیں (حیدرآباد دکن) ہوں اور ابھی دو ہفتے اور رہنا پڑے گا۔

۱- اس وقت میرے پاس ایسا زائد از ضرورت آدمی نہیں ہے جو آپ کی خواہش کے مطابق اس کام کو کرے۔یعنی خود اپنی دھن سے کرے، تنخواہ کے لیے نہیں بلکہ فرض کے لیے یہ کام کرے۔آپ مولانا احمد علی صاحب (۳۸) سے پوچھیے ان کے پاس علماء کا مجمع رہتا ہے، شاید وہ پتا بتاسکیں۔اگر تلاش پر نہ ملے تب مجھے اطلاع دیجیے گا۔ ہمارے فارغ التحصیل عموماً جوان ہیں، جو کام کو محنت کریں گے مگر مُسنّ آدمیوں کا سا رُعب ان میں نہ ہوگا۔

۲- مولانا احمد علی صاحب سے میں اچھی طرح واقف ہوں، بڑے مخلص کارکن ہیں اور تولیّت کے لیے ایمانداری شرط ہے اور یہ شرط ان میں پوری طرح موجود ہے مگر کہہ نہیں سکتا کہ وہ منظور کریں گے یا نہیں۔اس کے لیے بھی طریق انتخاب کی تعیین وقف نامہ میں کرنی ہوگی۔ کمیٹی میں ڈالنے سے بہتر شاید یہ ہوگا کہ ہر متولی اپنے بعد کے جانشین کا انتخاب بقاعدہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کرتا رہے۔

۳- وقف نامہ کے اغراض و مقاصد وہی ہوں جو آپ نے پہلے لکھے تھے۔(۳۹)

سیّد سلیمان

۳۰ جولائی،۳۵ء

حیدرآباد- توپ کا سانچہ نمبر ۴۱۱

مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ معرکۂ کارزارِ سیاست میں برسرِ پیکار تھے، ان کے لیے اس وقت اس نوع کے کسی کام کو اپنے ہاتھ میں لینا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے نیاز علی خان کے ایک خط کے جواب میں لکھا:

کلکتہ،

۹دسمبر،۱۹۳۶ء

مکرمی- السّلام علیکم

خط پہنچا، مجھے خیال ہوتا ہے کہ آپ کا ایک خط آیا تھا، جس میں آپ نے بعض انتظامات کی اطلاع دی تھی اور میں نے اس کے جواب میں لکھوا دیا تھا کہ یہ انتظامات بہتر ہیں اللہ آپ کی مساعی مشکور فرمائے۔قرآنی ادارہ کا معاملہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے، جس کے لیے کسی مضمون کا لکھ دینا یا کسی نقشۂ نصاب کا بنا دینا مفید ہوسکے گا۔قرآن کے لیے نصابِ تعلیم بجز قرآن کے اور کیا ہوسکتا ہے۔ اصل سوال اشخاص کا ہے اور اس روح تربیّت کا جو کسی حلقہ میں پیدا کی جائے، یہ بغیر اس کے حل نہیں ہوسکتا کہ کارداں اشخاص ہر وقت انصرامِ امور میں مدد دیں، اگر اس بارے میں آپ بروقت میرے مشورہ کے طالب ہوں گے تو جو کچھ مشورہ دے سکتا ہوں اس میں حتّی الوسع کوتاہی نہیں کروں گا۔

اس قسم کے اداروں کا مجھ سے بڑھ کر استقبال کرنے والا کوئی نہ ہوگا، لیکن زمانہ کی حالت ایسی ہورہی ہے کہ میں خود اپنی جانب سے پیش قدمی کا قصد نہیں کرسکتا، کوئی طالب امتیاز کے ساتھ بڑھتا ہے تو خود بھی بڑھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی مشکور فرمائے۔کام کیے جایئے اور جب نفاذِ کار کا وقت آئے تو تعیّن کے ساتھ مرتّبِ کار کی نسبت اطلاع دیجیے۔ میں جو کچھ مشورہ دے سکتا ہوں ضرور دوں گا۔(۴۰)

والسّلام

ابوالکلام

مولانا محمد اشرف علی تھانوی ،مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ مقتدر وممتاز علما کی طرف سے دارالاسلام کے تعلیمی منصوبہ کے انتظام و انصرام میں سرگرم شرکت سے معذرت کے باوجود نیاز علی خان نے بڑی استقامت سے دوسرے اصحاب علم و فضل سے اس منصوبہ کے بارے میں مشاورت کا سلسلہ جاری

رکھا۔ چنانچہ نیاز علی خان کا جن اہل علم ونظر سے اس سلسلے میں رابطہ استوار ہوا ان میں علامہ محمد اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) اور محمد اسد ایسے تھے کہ جنھوں نے اس منصوبے کی ترتیب وتشکیل کے علاوہ اسے عملی جامہ پہنانے میں سرگرم تعاون کیا۔

نیاز علی خان نے اگست ۱۹۳۵ء (جمادی الاولی ۱۳۵۴ھ) میں سید مودودی سے مراسلت کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنے خطوط میں قرآن مجید کی تعلیم کی غرض سے ایک ادارہ کے قیام سے متعلق اپنے عزائم کا اظہار کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس ادارہ کے متعلق ایک مفصل دستورالعمل (مقاصد اور اصول وطریق کار) مرتب فرمائیں۔ ساتھ ہی انہیں جمال پور- پٹھان کوٹ چلے آنے اور اسے اپنی تصنیفی وتالیفی اور اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی دعوت بڑے زور شور سے دی۔ سید مودودی نے اپنے خطوط میں شرح وبسط سے ادارہ دارالاسلام سے متعلق اپنی آراء وتجاویز سے آگاہ کیا اور اس کے مقاصد اور اصول وطریق کار کی وضاحت کی (۴۱)

سید ابوالاعلی مودودی نے ادارہ دارالاسلام کے بارے میں جو آرا اور تجاویز پیش کیں ان کا لب لباب حسب ذیل ہے:

۱- ادارہ کے ارکان تمام ایسے لوگ ہوں جو انگریزی یا عربی درسگاہوں کے تعلیم سے فارغ ہو چکے ہوں یا جن کے علمی استعداد اولی درجہ کی ہو۔ نیز ان میں کوئی ذہانت، کوئی اپچ، کوئی جوہر مخفی پایا جاتا ہو۔

۲- ادارہ میں باقاعدہ درس وتدریس کی ضرورت نہیں، عربی جاننے والے ارکان فرداً انگریزی جاننے والوں کو عربی اور علوم اسلامیہ پڑھائیں اور اسی طرح انگریزی تعلیم یافتہ حضرات عربی والوں کو انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی تعلیم دیں۔ ایک وقت ایسا ہونا چاہیے جس میں شیخ قرآن کا درس دے۔ یہ ایسا جامع درس ہونا چاہیے کہ اس ضمن میں حدیث، فقہ، حکمت اسلامیہ، اصول شرع، فلسفہء تاریخ اسلامی، غرض دنیا بھر کے مباحث و مسائل آسکتے ہیں۔ درس قرآن کے بعد تمام ارکان کو مطالعہ اور تحقیق میں مشغول ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں چار شعبے- فقہ، معاشیات، علوم عمران، فلسفہ اور نظری سائنس خاص طور پر توجہ کے محتاج ہیں۔ یہ سب علمی وتحقیقی کام اس بنیادی نظریہ کے ساتھ کیا جائے کہ قرآن اور سنت ہی علم کا منبع ہے۔ ادارہ کے تعلیم وتربیت سے جب ایک جماعت پوری طرح تیار ہو جائے تو اشاعت کا کام، تین زبانوں -عربی، انگریزی اور اردو میں- شروع کیا جائے۔ اس وقت علماء کے شور وغل مچانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، کیونکہ یہ لوگ ٦ سو برس پہلے کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایسے موقع پر صرف ماڈرن علماء ہی کام آسکیں گے۔ وہ اس زمانہ کی زبان میں اسلامی زبان میں اسلامی قوانین کی صحیح تعبیر پیش کریں گے اور قانون سازوں کو بتائیں گے کہ سوشل ریفارم کی صحیح صورت کیا ہے اور غلط صورت کیا ہے۔(۴۲)

۳- ہم خالص قرآن کی بنیاد پر اسلام کی نشأت ثانیہ چاہتے ہیں، ہمارا راستہ متأخرین مقلدین اور جدیدیت پسند متفرنجین دونوں سے الگ ہے۔ ہمیں ایک طرف روح قرآنی کو ٹھیک ٹھیک اپنے اندر جذب کرنا اور اپنی قوت فکر ونظر کو اصول اسلامی سے پوری طرح متحد کرنا ہے۔ دوسری طرف علم کی ان ترقیوں اور احوال کے ان تغیرات کا پورا پورا جائزہ لینا ہے جو گزشتہ سات آٹھ سو برس کی مدت میں ہوئی ہیں اور تیسری طرف صحیح اسلامی طریق پر افکار و معلومات کو مرتب اور قوانین کو مدون کرنا ہے تا کہ اسلام پھر سے بالفعل ایک حرکی قوت بن جائے اور دنیا میں مقتدی بننے کے بجائے مقتدی اور امام بن کر رہے۔(۴۳)

سید مودودی نے ادارہ دارالاسلام کے جو اصول و مقاصد متعین کیے تھے ان کے پیش نظر وہ اس ادارہ کے لیے کسی روایتی عالم دین خصوصا دارالعلوم دیوبند کے حلقہ میں سے کسی مقتدر عالم (مولانا محمد اشرف علی تھانوی وغیرہ) کے بطور شیخ و سرپرست تقرر کو موزوں خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے نیاز علی خان کے نام ایک خط میں لکھا:

> ''جناب مولانا اشرف علی تھانوی کے پاس ضرور تشریف لے جایئے اور ان سے مشورہ و امداد لیجیے، مگر مجھے امید نہیں کہ اس ادارہ کی رہنمائی کے لیے اس حلقہ سے کوئی موزوں آدمی مل سکے گا۔ ہم جس راستہ پر چلنا چاہتے ہیں اس میں علماء کا گروہ چند قدم سے زیادہ ہمارے ساتھ بھی نہیں چل سکتا کجا کہ وہ ہماری رہنمائی کرے۔ تاہم ان کا کوآپریشن حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔''(۴۴)'' مولانا اشرف علی تھانوی جن کا شمار ہندوستان کے بہترین علماء میں ہوتا ہے۔ ان حضرات سے استفادہ کرنا اور ان کی ہدایات سے روشنی حاصل کرنا ضروری ہے لیکن جس راستے پر ہم جانا چاہتے ہیں اس میں یہ حضرات ہماری پیشوائی اور قیادت نہ کر سکیں گے، بلکہ ہمارے ساتھ بھی نہ چل سکیں گے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنا دامن ماضی سے اس قدر باندھ لیا ہے کہ حال اور مستقبل سے عملا بالکل بے تعلق ہو گے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی ہماری پیشوائی نہیں کر سکتے جو تجدید کے زور میں کتاب وسنت کی صراط مستقیم اور سلف صالح کے طریقہ سے ہٹ گئے ہیں اور اعتدال پر قائم نہیں رہے۔''(۴۵)

ادارۂ دارالاسلام کی تنظیم و تاسیس کا سید مودودی کے علاوہ جس شخصیت نے بھر پور خیر مقدم کیا وہ آسٹروی نومسلم محمد اسد (۱۹۰۰-۱۹۹۲ء) تھے جو عربستان-نجد وحجاز- میں ۶ سالہ قیام اور مصر، شام، ترکی، عراق، ایران اور افغانستان وغیرہ مسلم ممالک کی طویل سیر و سیاحت کے بعد ۱۹۳۲ء، کے موسم گرما میں ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ محمد اسد کو ہندوستان وارد ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ سنجیدہ علمی وفکری حلقوں میں انہیں بڑی قدر و منزلت

حاصل ہوگئی۔خصوصا مغربی تہذیب وتمدن کی تنقید وتردید اور دفاع حدیث وسنت میں ان کی معرکہ الآراءتصنیف (Islam at the Crossroads) کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔علامہ محمد اقبال اور سید سلیمان ندوی جیسے مشاہیر امت نے ان کی اس تصنیف کو قدر وتحسین کی نگاہ سے دیکھا تھا (۴۶)۔علامہ محمد اقبال اس نومسلم کے فہم و تصوراسلام کے مداح تھے۔علامہ موصوف ہی کے ایماء پر ۱۹۳۴ء میں ان (اسد) کا اسلامیہ کالج میں بطور پروفیسر وڈین نظارت دینیہ تقررعمل میں آیا البتہ بعض دیگر اہم دینی وعلمی مشاغل کے سبب وہ بالفعل یہ منصب سنبھالنے سے قاصر رہے۔(۴۷)

نیاز علی خان نے نومبر ۱۹۳۵ء میں محمد اسد کو (جب کہ وہ سرینگر-کشمیر میں بخاری شریف کے ترجمۂ و تشریح اور اس کی طباعت واشاعت میں مشغول تھے) ایک خط لکھا جس میں ان سے تعلیم وتربیت کے اس منصوبے کے بارے میں مشورہ اور عملی تعاون طلب کیا۔ اسد نے جواباً مجوزہ منصوبے کو سراہا، اسے جدید مغربی تعلیم کے پھیلائے ہوئے زہر کے لیے ایک تریاق قرار دیا، نصاب ونظام تربیت کے بارے میں بعض تجاویز پیش کیں اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تعاون واشتراک عمل پر آمادگی جوش وجذبے کے ساتھ ظاہر کی۔محمد اسد کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس نوع کے تعلیمی ادارے کے قیام کا ارادہ رکھتے تھے۔چنانچہ ادارۂ دارالاسلام کے تعلیمی منصوبے کی تجویز کے متعلق چودھری نیاز علی خان کے نام ایک خط میں لکھا:

> ''واقعتاً گذشتہ کئی سالوں سے میرے ذہن میں بھی یہ خیال تھا کہ میں دینی تعلیم کا کوئی ایسا ہی ادارہ قائم کروں جیسا کہ آپ نے تجویز کیا ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے نوجوانوں میں مذہبی معتقدات منہدم ہو رہے ہیں اور اس بات کی ضرورت ہے کہ جدید لادینی تعلیم کے فاسد اثرات کا فوری طور پر ازالہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمارے روایتی قدامت پسند علماء ہماری کوئی مدد نہیں کرسکیں گے۔ یہ علماء اسلام کے ظاہری مذہبی رسوم سے تمسک رکھتے ہیں اور اسلام کے اخلاقی اور روحانی تقاضوں کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ میرا خیال ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا ہے جس میں مسلم نوجوان نہ صرف قرآن اور حدیث کے علوم حاصل کر سکیں۔مختصرا اس ادارے کا کام اس مسلم دنیا کے لیے دینی وروحانی قیادت کی تعلیم وتربیت ہونا چاہیے۔ میں آپ کی اس آرزو کی قدر کرتا ہوں کہ مجوزہ ادارہ قدیم طرز کے مدرسوں کی طرح ہونا چاہیے، کیونکہ ان مدرسوں کا ماحول روایتی قدروں کا تحفظ کرتا ہے اور جدید لادینی نظام تعلیم کے پھیلتے ہوئے زہر کا تریاق مہیا کرتا ہے۔ بہرحال آپ کا تعلیمی منصوبہ اس کام سے

مطابقت رکھتا ہے جو میں اس وقت کر رہا ہوں (ترجمہ وشرح صحیح بخاری)۔ حقیقتاً یہ دونوں کام ایک دوسرے کے مددگار ہوں گے۔ چنانچہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کا منصوبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کا پیغام ہے جس کے ذریعے سے میرا دیرینہ خواب عملی شکل اختیار کر لے گا۔

جناب خان صاحب مجھے آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس اہم کام کے لیے میں آپ کی فراخ دلانہ مساعی کا معترف ہوں۔ اگر یہ ادارہ جاری ہو جائے اور ایک کارآمد ادارہ بن جائے جس کے متعلق مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے تو مسلمان آبادی کے ایک خاطر خواہ حصے کو اس کی طرف مائل کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا، اور پھر ہم بتدریج اس کی توسیع کر سکیں گے حتیٰ کہ یہ اسلامی اکادمی مسلم ہندوستان کے لیے ایک قابل فخر ادارہ بن جائے۔''(۴۸)

نیاز علی خان کی دعوت وتحریک پر محمد اسد نے ادارۂ دارالاسلام کی تنظیم وتاسیس کے سلسلہ میں نیاز علی خان کا شریک کار بننے کا اصولی فیصلہ کر لیا(۴۹)۔ نیاز علی خان نے سید مودودی کے نام ایک خط (محررہ ۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء) میں لکھا:

''میں نے اپنے ایک مجوزہ ادارے کے لیے جناب سے مشورہ کیا تھا، اب میں اراضی وقف پر مکانات تعمیر کر رہا ہوں اور اس ادارہ کے متعلق چند بزرگوں سے بات چیت کی ہے......مولانا محمد اسد، جرمن نومسلم، جو حیدرآباد کی طرف سے رسالہ ''مسلم کلچر'' (کذا) اسلامک کلچر کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں، انہوں نے میرا شریک کار ہونا منظور کر لیا ہے۔ میں نے ان سے ذکر کیا تھا۔ ان کو بھی جناب کی ذات والا صفات سے بہت عقیدت ہے۔''(۵۰)

سید مودودی کو مجوزہ منصوبے میں محمد اسد کی گہری دلچسپی اور عملی تعاون پر آمادگی کا علم ہوا تو انہوں نے اس پر گہرے اطمینان اور خوشی ومسرّت کا اظہار کیا اور ایک خط بنام نیاز علی خان (محررہ ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ/۳ دسمبر ۱۹۳۶ء) میں لکھا:

''جناب محمد اسد صاحب سے حیدرآباد میں ایک مرتبہ مل چکا ہوں۔ ان کی کتاب "Islam at the Crossroads" اور ترجمہ بخاری دونوں میری نظر سے گزری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دورِ جدید میں اسلام کو جتنے غنائم یورپ سے ملے ہیں ان میں سے یہ سب سے زیادہ قیمتی ہیرا ہے۔ اسلام کی اسپرٹ اس میں پوری طرح حلول کر گئی ہے۔ اور اسلام کو اس نے ان علماء سے زیادہ اچھی طرح سمجھا ہے، جو پچاس برس سے درس وتدریس میں مشغول ہیں۔ اگر یہ شخص آپ کے ادارہ کے لیے مل گیا ہے تو میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور نہایت خوش قسمت سمجھتا

ہوں۔ اب امید ہے کہ یہ تخیّل ضرور پھل پھول لائے گا''۔(۵۱)

محمد اسد نے نیاز علی خان کی دعوت وتحریک پر ۱۹۳۶-۱۹۳۷ء کے دوران میں، خصوصا ۱۹۳۶ میں سری نگر سے لاہور منتقل ہونے کے بعد، متعدد بار جمال پور کا دورہ بھی کیا۔ محمد اسد جمال پور- پٹھان کوٹ اور لاہور میں نیاز علی خان کے ساتھ ادارۂ دارالاسلام کے تعلیمی منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے مشاورت کرتے رہے۔ نیاز علی خان کے نام اسد کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جمال پور (پٹھان کوٹ)، میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرنا چاہتے تھے اور اس غرض سے وہاں رہائش اور مطبع کے لیے ایک قطعہ زمین خرید کر وہاں ضروری عمارات تعمیر کرانا چاہتے تھے لیکن ان کی مالی مشکلات آڑے آتی رہیں چنانچہ وہ جمال پور منتقل نہ ہو سکے۔(۵۲)

محمد اسد اس تعلیمی وتربیتی منصوبے کی جزئیات وتفصیلات کے متعلق غور وفکر کے ساتھ ساتھ اس کے لیے علامہ محمد اقبال کے تعاون وسرپرستی کے حصول کے لیے بھی برابر کوشاں رہے۔ محمد اسد چودھری نیاز علی خان کے نام ایک خط (محررہ ۱۸ نومبر ۱۹۳۶ء، از ماڈل ٹاؤن، لاہور) میں لکھتے ہیں:

> ''جیسا کہ میں آپ کو آگاہ کر چکا ہوں کہ میں مدرسہ کے اجراء سے متعلق آپ کی اس تجویز سے متفق ہوں کہ وہ مولویوں کے روایتی مدرسوں سے مختلف ہوگا۔ ۔ ۔ روایتی علماء عموماً علمی لحاظ سے نہایت پسماندہ اور دنیا کے معاملات سے بے خبر ہوتے ہیں، چنانچہ وہ نئی نسل میں اسلام کی تبلیغ وترویج کے کام کو فائدہ نہیں بلکہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ میں آپ کو پرزور مشورہ دوں گا کہ آپ روایتی علماء کے طبقہ اور ان کے طریق کار سے دور رہیں اور اپنے لیے ایک علیحدہ طریقہ کار تجویز کریں۔ ۔ ۔ ان دنوں میں آپ کے مدرسہ کی تعلیمی اسکیم کے متعلق سوچ رہا ہوں اور میرے خیال میں میرے ذہن میں مفید تجاویز ہیں جو آپ کو آیندہ ملاقات پر پیش کروں گا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ڈاکٹر محمد اقبال بھی آپ کی تعلیم اسکیم میں دلچسپی لیں۔ ان کا آپ کے تعلیمی منصوبہ میں عملی تعاون واشتراک بہت مفید ثابت ہوگا۔(۵۳)

اسد کی کوششوں کی بدولت علامہ اقبال دارالاسلام کے تعلیمی منصوبے میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ نیاز علی خان بنام سید مودودی (محررہ ۸ مارچ ۱۹۳۷ء) رقم طراز ہیں:

> ''علامہ عبد اللہ یوسف علی صاحب میری تحریک پر یہاں تشریف لائے تھے۔ میں یہ بات دہراتا ہوں کہ یہ ادارہ خالص قرآن کی تعلیم کے لیے مخصوص ہو گا۔ اگرچہ اس سلسلہ میں اراکین ادارہ کی علمیت کے مطابق سبھی کچھ آجائے گا مگر اصل غرض تعلیم قرآن ہی کی ہوگی۔''

مولانا اسد یہاں (جمال پور، پٹھان کوٹ) آ کر کئی روز قیام کر گئے ہیں وہ یہاں اپنا گھر بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اس ادارہ کو اپنی تالیف وتصانیف سے جو وقت بچے، دینے کے لیے آمادہ ہیں۔مگر ابھی تک وہ مالی معاملات سے متعلق پریشان ہیں۔علامہ محمد اقبال میری اس تجویز (منصوبے) سے بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ بلکہ ان کے خیالات تو بہت بلند ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس ادارہ کو ان شاء اللہ ایسا بنائیں گے کہ اس کا اثر یورپ تک پہنچے گا۔''(۵۴)

اس دوران میں (۱۹۳۶-۱۹۳۷ء) محمد اسد انفرادی طور پر بھی اور نیاز علی خان کی معیت میں بھی علامہ اقبال سے ملاقاتیں کرتے رہے اور ان سے ادارۂ دار الاسلام کے بارے میں رہنمائی اور مشورہ لیتے رہے(۵۵) علامہ نے چوہدری نیاز علی خان کے تجویز کردہ ادارے کو وقت کی اہم ضرورت خیال کرتے ہوئے اس کے قیام کی حوصلہ افزائی فرمائی۔علامہ نیاز علی خان کے نام ایک خط (محررہ ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء) میں رقم طراز ہیں:

''آپ کا خط ابھی ملا، آپ ضرور تشریف لائیں، میں آپ سے ادارہ کے متعلق گفتگو کروں گا۔ اسلام کے لیے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔جن لوگوں کو احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ان شاء اللہ آپ کا ادارہ اس مقصد کو باحسن وجوہ پورا کرے گا۔علماء میں مداہنت آ گئی ہے، یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پروا اور احکام کے تصرف میں ہیں۔اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خودغرض ہیں اور ذاتی منفعت وعزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں ہے۔عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض راہنما نہیں ہے'' (۵۵ب)

ایسی ہی ایک ملاقات (۱۹۳۷ء) میں علامہ نے مجوزہ ادارے کو روایتی طرز کا ایک دینی مدرسہ بنانے کے بجائے اسے ایک اعلیٰ پائے کا علمی وتحقیقی ادارہ، جہاں علوم دینیہ وعلوم جدیدہ کے ماہرین فقہ وقانون اسلامی کی تدوین جدید جیسا اہم ترین وظیفہ انجام دے سکیں، بنانے کا مشورہ دیا تھا۔علامہ نے اس اہم کام کی نگرانی اور رہنمائی کے لیے محمد اسد اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نام تجویز کیے تھے۔سید نذیر نیازی نے اس ملاقات کی روئداد بیان کی ہے۔ذیل میں اس روئداد کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے:

''چودھری نیاز علی صاحب جاوید منزل (میوروڈ، لاہور) تشریف لائے۔علامہ محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویئس) بھی ان کے ساتھ تھے۔ چودھری صاحب نے علامہ اقبال کی مزاج پرسی کے بعد عرض کیا کہ انھوں نے قلعہ جمال پور میں ایک وقف 'دارالاسلام' کے نام سے قائم کیا ہے

تا کہ وہاں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ حضرت علامہ اس کام میں ان کی رہنمائی فرمائیں اور جیسا ان کا مشورہ ہو اس کے مطابق بعض علمائے دین کو 'دارالاسلام' آنے کی دعوت دی جائے۔ حضرت علامہ نے فرمایا: ''دینی مدارس کی تو کوئی کمی نہیں، بہتر ہوگا چودھری صاحب اس وقت اس سے کوئی اور کام لیں''۔ چودھری صاحب نے عرض کیا آپ ہی فرمایئے اس وقف سے کیا کام لینا چاہیے۔ حضرت علامہ نے فرمایا: ''میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقۂ اسلامی کی تشکیل جدید ہے۔ بحالت موجود ہم روز بروز اسلام سے دور ہٹتے چلے جارہے ہیں اور اس کی وجہ ہیں وہ سیاسی و اجتماعی مسائل جنھوں نے موجودہ زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کرلی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء ان مسائل کو سمجھیں اور حالات کو اسلامی شرائع کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں''۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ اکابر علماء کا تو 'دارالاسلام' آنا محال نظر آتا ہے، وہ اپنے اپنے مراکز میں بیٹھے دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حضرت علامہ نے کہا: ''یہ ٹھیک ہے مگر اس کے باوجود ملک میں ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی نہیں جن کے دل میں اسلام کا درد ہے اور جو حالات حاضرہ سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان میں نئے اور پرانے تعلیم یافتہ سبھی شامل ہیں۔ ضرورت ان کو جمع کرنے کی ہے''۔ پھر حضرت علامہ نے محمد اسد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چودھری نیاز علی صاحب سے کہا: ''دیکھیے! یہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں، کیوں نہ یہ اس کام کو ہاتھ میں لیں۔'' (۵۶)

محمد اسد اور نیاز علی خان کے ساتھ ان ملاقاتوں میں علامہ اقبال نے مجوّزہ ادارہ میں عربی کی اعلیٰ تعلیم اور جدید اسلامی افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت کے لیے جامعۂ ازھر، قاہرہ سے چند ایک علماء کی خدمات کے حصول کا بھی مشورہ دیا تھا۔(۵۷) چنانچہ ان (علامہ) کے مشورے اور ہدایت پر شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ المراغی (۱۸۸۱-۱۹۴۵ء) کے نام (۵۸) علامہ اقبال کی طرف سے خط کا مسودہ سید ابوالاعلیٰ مودودی سے تیار کرایا گیا۔ جسے عربی میں منتقل کرکے ارسال (۱۵/ اگست ۱۹۳۷ء) کیا گیا۔(۵۹) خط میں مجوزہ ادارے کی رہنمائی اور وہاں جمع ہونے والے علوم جدیدہ کے فارغ التحصیل حضرات اور علوم دینیہ کے ماہرین کو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے واقف کرانے اور فکر اسلامی کی تشکیل نو میں ان کی رہنمائی و مدد کے لیے ایک روشن خیال ازہری عالم کو، جو علوم شرعیہ اور تاریخ و تمدن اسلامی میں ماہر ہو نیز زبان انگریزی پر بھی قدرت کاملہ رکھتا ہو، بھیجنے کی (جامعۂ ازہر کے

خرچ پر) درخواست کی گئی۔(۶۰) شیخ الازہر نے علامہ محمد اقبال اوران کے رفقاء کی مساعی کی تعریف کی اور ساتھ ہی مطلوبہ صفات وخصوصیات کے حامل ازہری عالم کو روانہ کرنے سے معذوری ظاہر کی کہ اس وقت علمائے ازہر میں سے انگریزی زبان پر قدرت رکھنے والا کوئی شخص موجود نہ تھا۔(۶۱) دریں حالات مجوزہ منصوبے کو عملی شکل دینے کے عمل کا آغاز ہوا۔ علامہ اقبال نے محمد اسد، سید محمد شاہ(۶۲) اور سید مودودی کو، جو اس وقت حیدرآباد میں مقیم تھے، ادارہ کا تعارف نامہ (پراسپکٹس) تحریر کرنے کے لیے مقرر کیا۔ نیاز علی خان بنام سید مودودی (محررہ ۸/ اگست ۱۹۳۷ء) لکھتے ہیں:

''۳ تاریخ (۳، اگست ۱۹۳۷) کو حضرت علامہ سر محمد اقبال کے مکان پر ان کی صدارت میں یہاں کے ادارہ کے متعلق مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ جرمن نومسلم علامہ محمد اسد اور سید محمد شاہ کے علاوہ تین چار اور بھی احباب موجود تھے۔ مفصل کارروائی سید محمد شاہ نے نوٹ کر لی تھی۔ جامعۂ ازہر کی چٹھی بعد مناسب ترمیم لکھوا کر بھیج دی گئی ہے اور مولانا اسد، سید محمد شاہ اور جناب کو ادارہ کا پراسپکٹس تحریر کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔''(۶۳)

ساتھ ہی نیاز علی خان کی طرف سے سید مودودی کو حیدرآباد سے جمال پور- پٹھان کوٹ، چلے آنے کی دعوت دی گئی۔ نیاز علی خان اور سید مودودی کے مابین مراسلت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسد بھی انھیں (سید مودودی کو) دارالاسلام منتقلی کے لیے تحریک کرتے رہے۔(۶۴) چنانچہ ان دونوں (نیاز علی خان اور محمد اسد) کی دعوت پر سید مودودی اکتوبر ۱۹۳۷ء کو حیدرآباد سے جمال پور آئے، جہاں دارالاسلام کی تعلیمی اسکیم کے بارے میں تفصیلی غور وخوض ہوا۔ جس کے بعد یہ تینوں حضرات منصوبہ کو حتمی شکل دینے کے لیے علامہ اقبال کی خدمت میں لاہور حاضر ہوئے۔(۶۵) لاہور میں تین روز تک علامہ سے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں تینوں حضرات کا (حضرت علامہ کے اس خیال سے متعلق) اتفاق رائے تھا کہ اسلامی قانون کی تدوین جدید ہونا چاہیے اور چند مستعد نوجوانوں کو اس کام کے لیے تربیت دی جائے۔(۶۶) باہمی مشاورت سے مجوزہ ادارہ کا نام ''دارالاسلام'' تجویز ہوا۔ جس کے اغراض ومقاصد علامہ اقبال کے اپنے الفاظ میں طے پائے۔(۶۷)

دسمبر ۱۹۳۷ء کو ادارہ دارالاسلام، باضابطہ طور پر رجسٹرڈ کرایا گیا۔ ۶ رکنی 'وقف کمیٹی دارالاسلام' میں محمد اسد کا نام بھی شامل کیا گیا۔(۶۸) مارچ ۱۹۳۸ء میں سید مودودی حیدرآباد دکن سے دارالاسلام منتقل ہوئے۔(۶۹) ۱۴ صفر ۱۳۵۷ھ/ ۱۶، اپریل کو جمال پور میں دارالاسلام وقف کمیٹی کے اجلاس میں، جس میں محمد اسد بھی شریک ہوئے، سید مودودی نے وقف دارالاسلام کے اغراض ومقاصد کی تشریح کی، اس کے طریق کار کے بارے میں تجاویز پیش

کیں اور نظام نامہ دارالاسلام کا خاکہ پیش کیا۔(۷۰) جس کی نقلیں ملک کے چالیس ایسے ممتاز اہل علم ونظر، جنہوں نے گزشتہ دو ایک سال کے دوران میں دارالاسلام کی تجویز کے ساتھ خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا تھا، بھیجی گئیں اور انہیں مجوزہ ادارے کے صدر مقام جمال پور (پٹھان کوٹ) میں تشریف لا کر ادارہ کے دستور العمل کو حتمی شکل دینے کے لیے، مجلس مشاورت میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔(۷۱) اسی اثناء میں ڈاکٹر محمد اقبال کا سانحہ ارتحال پیش آیا (۲۱، اپریل ۱۹۳۸ء) اور 'دارالاسلام' اپنے مربی و سرپرست سے محروم ہوگیا۔ تقریباً عرصہ چھ ماہ بعد مجلس مشاورت کے اجلاس منعقدہ ۱۷-۱۹ شعبان ۱۳۵۷ھ/۱۲-۱۴، اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں 'دارالاسلام' کی باضابطہ طور پر تأسیس عمل میں آئی (۱۹ شعبان ۱۳۵۷ھ/۱۴، اکتوبر ۱۹۳۸ء) محمد اسد اس اجلاس میں شریک نہ ہوسکے۔ بایں ہمہ 'دارالاسلام' نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رہبری و رہنمائی میں اپنے عملی سفر کا آغاز کیا۔(۷۲) لیکن جلد ہی چوہدری نیاز علی خان سے بعض پالیسی امور میں اختلاف ونزاع کے پیدا ہو جانے پر سید ابوالاعلیٰ مودودی ۱۹۳۹ء کو لاہور چلے آئے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی جماعت اسلامی کے قیام (۱۹۴۱ء) کے بعد ۱۹۴۲ء میں چوہدری صاحب سے مصالحت پر ایک بار پھر پٹھان کوٹ چلے گئے اور دارالاسلام کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لی۔ تاہم اب ان کی زیادہ تر توجہ جماعتِ اسلامی کی تنظیم اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے صالح افراد کی تعلیم وتربیت، تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت جیسے امور پر مرکوز رہی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد سید مودودی اپنے رفقاء کے ساتھ لاہور چلے آئے جبکہ دارالاسلام جوہر آباد-خوشاب (پنجاب، پاکستان) میں منتقل ہوگیا۔ چوہدری نیاز علی خان کی مخلصانہ مساعی کے باوجود یہ ادارہ اکابر علماء کی توجہ حاصل نہ کر سکا۔ چنانچہ جوہر آباد میں ایک بورڈنگ ہاؤس کے قیام کے علاوہ دینی تعلیم کے لیے ایک معمولی مدرسے کا اجراء تو عمل میں آیا البتہ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں قرآن حکیم کی تعلیم کی اشاعت اور علوم دینیہ وعلوم جدیدہ کے ماہرین کی تیاری کا خواب حقیقت کا روپ نہ اختیار کر سکا۔(۷۳)

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جاچکا ہے محمد اسد شروع ہی سے دارالاسلام کی تعلیمی اسکیم کے پرجوش حامی تھے اور وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری طرح سے سرگرم عمل رہے۔ اس غرض سے انہوں نے متعدد بار جمال پور میں قیام کیا۔(۷۴) انہوں نے دارالاسلام میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا، تاہم راہ میں بعض رکاوٹیں آڑے آتی رہیں اور وہ وہاں منتقل نہ ہوسکے۔ ان میں اہم تر مجلّہ ''اسلامک کلچر' کی ادارت اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری تھی۔ اسد کو مالی مشکلات کا بھی سامنا تھا جس کی بدولت وہ حسب منشا مکان کی تعمیر اور دیگر لوازمات کی فراہمی سے قاصر تھے۔ برِّعظیم میں آمد کے بعد سنجیدہ علمی وفکری سرگرمیوں میں انہاک واشتغال کی وجہ سے یورپی اخبارات و رسائل کے لیے مراسلہ نگاری کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا اور اب ان کی آمدنی کا کوئی

مستقل ذریعہ باقی نہ رہا تھا۔ بخاری شریف کے ترجمہ وشرح کی اشاعت پر بھی کثیر مصارف اٹھ رہے تھے، چنانچہ وہ کامل یکسوئی کے ساتھ 'دارالاسلام' کے ساتھ وابستہ نہ رہ سکے۔ اسد کو یہ تمام مشکلات و مسائل 'دارالاسلام' کی تعلیمی اسکیم سے ربط و ضبط سے باز نہ رکھ سکتی تھیں اگر بعض دیگر اہم حوادث زمانہ جن کا تذکرہ آئندہ سطور میں آ رہا ہے، پیش نہ آئے ہوتے۔ بہر حال عوامل خواہ کچھ بھی کیوں نہ رہے ہوں، علامہ اقبال کی وفات اور اسد کی دارالاسلام کے منصوبے سے عملاً علیحدگی کے سبب اس عظیم تعلیمی اور علمی وفکری منصوبے کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔ دارالاسلام کے بانیوں نے ایک مقتدر و ممتاز درس گاہ کے قیام سے متعلق جو نقشہ ترتیب دیا تھا وہ بروئے کار نہ لایا جا سکا۔ یوں فکر اسلامی (فقہ وعلم کلام) کی تشکیل و تدوین نو کی غرض سے قدیم و جدید علوم میں اعلیٰ پائے کے ماہرین کی تیاری کی غرض سے ایک اسلامی یونیورسٹی کا جو تخیّل حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال نے پیش کیا تھا وہ برگ و بار نہ لا سکا۔

خلاصۂ بحث:

نیاز علی خان کی 'دارالاسلام' کی تعلیمی و تربیتی اسکیم سے علامہ محمد اقبال، محمد اسد اور سید مودودی کی گہری دلچسپی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تینوں کے مابین باہمی تعاون و اشتراک عمل، دراصل ان تینوں کے مابین جدید دنیائے اسلام کو درپیش مسائل و مشکلات کے اسباب و محرکات کی تشخیص اور احیائے اسلام کے لائحہ عمل کی ترتیب و تشکیل میں فکری و نظری ہم آہنگی کا غماز تھا۔ عالم اسلام کے یہ تینوں مفکر مسلم ممالک میں انیسویں صدی کے وسط سے جاری تجدد و مغربیت (Westernization) بالخصوص تعلیم، قانون اور تہذیب و معاشرت کے میدانوں میں مغرب کی اندھی تقلید کو ملت اسلامیہ کے دینی و ملی تشخص کے از حد منافی خیال کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مسلم دنیا میں صدیوں سے جاری روایتی تعلیمی نظام اور فکر اسلامی (علم کلام و فقہ) کے قدیم سرمائے کو عصر جدید کے تقاضوں بالخصوص جدید مسلمان نسل کو دین اسلام پر مطمئن و قائم رکھنے اور سب سے بڑھ کر دین اسلام کو دور حاضر میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک پروگرام کے طور پر روبہ عمل لانے کے لیے ناکافی و ناموزوں خیال کرتے تھے۔ وہ روایتی دینی مدارس میں رائج نظام تعلیم سے بھی مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ وہ اس نظام تعلیم کی تشکیل نو کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی (علم کلام و فقہ) کی تشکیل جدید کو بھی از بس لازم گردانتے تھے۔ یہی چیز نیاز علی خان کے منصوبے کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے ان کے مابین تعاون و اشتراک عمل کا محرک بنی تھی۔ (۷۵)

حوالہ جات وحواشی

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: خان، سر سیّد احمد، ۱۹۸۶ء، ''اسبابِ بغاوتِ ہند''، ص۱۲۲-۱۲۵؛ قریشی، اشتیاق حسین، ''برّعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ''، مترجم ہلال احمد زبیری، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص۲۸۶-۲۹۱؛ ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو، ''ہمارے ہندوستانی مسلمان''، مترجمہ صادق حسین، لاہور: اقبال اکیڈیمی، ۱۹۴۶ء، ص۲۰۷، ۲۵۱، ۲۶۱، و بمواضع عدیدہ؛ علی، عبداللہ یوسف، ''انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدّن کی تاریخ''، لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء، ص۱۷۷-۱۷۸؛ سلیم، سیّد محمد، ''مسلمان اور مغربی تعلیم پاک و ہند میں''، لاہور: ادارۂ تعلیمی تحقیق، ۱۹۸۵ء، ص۱۷۰-۱۷۴؛ باسو، بی. ڈی (Basu, B.D.)، "History of Education Under the Rule of East India Company"، کلکتہ: آر چیٹر جی، س۔ن، ص ۵۰-۱۷، ۱۰۵-۱۰۹؛ وہی مصنف، " The Rise of the Christian Power in India "، کلکتہ: آر چیٹر جی و سارکر اینڈ سنز ۱۹۲۳ء، ج ۵، ص ۱- ۳۵؛ پاول، ایورل این (Powell, Avril Ann)، "Muslims and Missionaries in Pre-Mutiny India"، سرے- یو.کے: کرزن پریس، ۱۹۹۳ء، ص۷۸-۷۹، ۱۹۵-۱۹۶، ۱۹۹-۲۰۱۔

(۲) شہابی، مولانا انتظام اللہ، ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء''، دہلی: دینی بک ڈپو، س۔ن، ص۳۱ ؛ راہی، اختر (اگست ۱۹۹۲ء) ، ''سیّد ناصر الدّین ابو المنصور دہلوی اور مسیحی-مسلم مناظراتی ادب''، مشمولہ ''عالم اسلام اور عیسائیت'' (اسلام آباد)، ۲:۸، ص۵-۸؛ دُتاسی، گارسان، ''مقالاتِ گارساں دُتاسی''، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۳ء، ص۷۹ و بمواضع عدیدہ۔

(۳) دارالعلوم دیوبند کے قیام، اس کی تعلیمی پالیسی، نصابات اور جدید مغربی تعلیم کے بارے میں اس کے بانیوں کے خیالات و آراء کے بارے میں ملاحظہ ہو: رضوی، سیّد محبوب، ''تاریخ دارالعلوم دیوبند''، ۲ جلدیں لاہور: ادارۂ اسلامیات، ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء ؛ جالندھری، رشید احمد، ۲۰۰۴ء، ''برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم: ایک ناقدانہ جائزہ''، جلد اول ''دارالعلوم دیوبند''، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۴ء، خصوصا باب سوئم و چہارم، ص ۱۱۵-۱۸۴۔

(۴) تفصیل کے لیے دیکھیے: گیلانی، مناظر احسن، ''سوانح قاسمی''، لاہور: مکتبۂ رحمانیہ، س۔ن، ج۲؛ رضوی، سیّد محبوب، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء، ''تاریخ دارالعلوم دیوبند''، ۲ جلدیں۔ مزید دیکھیے:

مٹکاف، باربرا ڈی (Metcalf, Barbara D.)، "Islamic Revival in British India:

Deoband, "1860-1900"، نئی دہلی : اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس،۲۰۰۲ء ؛ فاروقی، ضیاء الحسن،۱۹۶۳ء، "The Deoband School and the Demand for Pakistan"، دہلی و بمبئی : ایشیا پبلشنگ ہاؤس،۱۹۶۳ء،ص۲۵-۳۰،۴۲-۴۵؛ احمد،عزیز،"An Intellectual History of Islam in India"، ایڈنبرا: ایڈنبرا یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۹ء،ص۵۷-۵۸۔

(۵) دیکھیے : حالؔی، الطاف حسین،۲۰۰۴ء، ''حیاتِ جاوید''، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان،۲۰۰۴ء، ص۳۸۲-۳۸۴،۳۹۶-۳۹۹ و بمواضع عدیدہ؛ لیلی ویلڈ، ڈیوڈ (Lelyveld, David)، "Aligarh's First Generation: Muslim Solidarity in British India"،لاہور: بک ٹریڈرز،۱۹۹۱ء، ص۲۰۵-۲۰۷۔

(۶) جین، ایم ایس (Jain, M.S.)، "The Aligarh Movement: Its Origin and Development"، کراچی: کریم سنز، ۱۹۷۹ء،ص۱۶۸-۱۷۰؛ لیلی ویلڈ (Lelyveld)، ۱۹۷۹ء، ص۲۰۳-۲۱۰۔

(۷) ندوی، سیّد ابوالحسن علی، ''مسلم ممالک میں اسلامیّت اور مغربیت کی کشمکش''، کراچی: مجلسِ نشریاتِ اسلام، ۱۹۸۱ء، ص۱۰۱-۱۰۲۔

(۸) ایضاً،ص۹۳۔

(۹) ندوی، سیّد ابوالحسن علی، ''حیاتِ عبدالحی''،کراچی: مجلس نشریات اسلام، س۔ن، ص۱۴۲-۱۴۳؛ الحسنی، سیّد محمد، ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری بانیٔ ندوۃ العلماء''، کراچی: مجلس نشریات اسلام،۱۹۸۴ء،ص۱۱۶-۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۵؛ احمد،عزیز، ۱۹۶۹ء،ص۵۹؛ مٹکاف، "Islamic Revival in British India", ص۳۳۸-۳۳۹۔

(۱۰) تفصیل کے لیے دیکھیے : الحسنی، محمد، ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری''،ص۱۱۶-۱۲۵،۱۵۵-۱۵۹،۱۹۴-۱۹۶ و بمواضع کثیرہ؛ ندوی، سیّد ابوالحسن علی، س.ن، ''حیات عبدالحی''، ص۱۴۲-۱۴۳؛ ندوی، سیّد سلمان حسینی، ۲۰۰۴ء، ''ہمارا نصاب تعلیم کیا ہوا؟''، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۲۰۰۴ء، ص۱۲۳-۱۲۴، ۱۹۹-۲۳۳؛ احمد، عزیز، "An Intellectual History of Islam in India"،ص۵۸-۵۹۔

(۱۱) نعمانی، شبلی، ''خطبات شبلی''، اسلام آباد و لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء،ص۸۰۔

(۱۲) الحسنی، محمد، ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری''،ص۱۵۵، ۱۵۸-۱۵۹۔

(۱۳) ایضاً،ص۱۵۷۔

(۱۴) ایضاً،ص۱۹۱۔

(۱۵) مٹکاف (Metcalf)، "Islamic Revival in British India"، ص۳۴۴؛ زمان، محمد قاسم، "The

"Ulama in Contemporary Islam: Custodians of Change"، کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۴ء، ص۲۷۔

(۱۶) ندوی، سیّد سلمان حسینی، ''ہمارا نصاب تعلیم کیا ہوا؟''، ص۱۲۳، ۱۲۴-۱۴۴، ۱۹۹-۲۳۳۔

(۱۷) الحسنی، محمد، ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری''، ص۲۹۵۔

(۱۸) ندوی، سیّد سلیمان، ''حیات شبلی''، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۲۰۰۶ء، ''دیباچہ''، ص۱۹-۲۰، مزید دیکھیے: ص۱۳۱۔

(۱۹) نعمانی، شبلی، ''خطبات شبلی''، ص۸۸-۸۹۔ دینی مدارس کے نصابات کی تدوین نو نیز دینی مدارس میں انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی کے آراء و خیالات کے جائزہ کے لیے دیکھیے: ندوی، سیّد سلیمان، ۲۰۰۶ء، ''دیباچہ''، ص۱۹-۲۰، ۱۳۱ و بمواضع کثیرہ؛ ضیاء الدین اصلاحی، ۲۰۰۶ء، ''مسلمانوں کی تعلیم''، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۲۰۰۶ء، ص۱۳۰-۱۸۲؛ زمان، محمد قاسم، "The Ulama in Contemporary Islam: Custodians of Change"، ص۶۹-۷۳؛ اکرام، ۱۹۹۴ء، ''یادگار شبلی''، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۴ء، ۲۸۲-۳۱۳۔

(۲۰) نعمانی، شبلی، ''خطبات شبلی''، ص۸۶۔

(۲۱) ندوی، سیّد سلیمان، ''حیات شبلی''، ''دیباچہ''، ص۲۰-۲۱۔

(۲۲) ندوی، سید سلیمان، ''حیات شبلیؒ''، ص۱۳۵۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings، ۱۷۷۲-۱۷۸۵ء) اور اُس کے جانشین کارن والیز (Cornwallies، ۱۷۸۶-۱۷۹۸ء) نے قدیم عدالتی نظام کی از سرِ نو تنظیم و تشکیل کی طرف خاص توجہ دی۔ چنانچہ ان دونوں کے ادوار میں فوجداری اور دیوانی کی عدالتوں کی تنظیم نو کی گئی۔ متعدد نئی عدالتیں قائم ہوئیں جن کے عہدے انگریزوں کے لیے مختص کر دیے گئے، جبکہ مسلمان قاضیوں کے دائرہ عمل کو محدود سے محدود تر کر دیا گیا۔ اب ضلعی دیوانی عدالتوں کی صدارت انگریز کلکٹر مسلمان مفتیوں اور ہندو پنڈتوں کے تعاون سے کرنے لگے۔ یہ عدالتیں مسلمانوں کے شخصی و عائلی قوانین سے متعلق مقدمات کے فیصلے شرعی قانون کے مطابق کرتی تھیں۔ کارن والیز کے دور میں اسلامی قانون سے نابلد انگریز ججوں اور قانونی افسروں کی سہولت کے لیے حنفی فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کیا گیا۔ ہدایہ کا پہلے فارسی میں ترجمہ گورنر جنرل سر جان شور (Sir John Shore، ۱۷۹۷-۱۷۹۸ء) کے ایماء پر قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین کاکوروی علوی (۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ھ) نے کیا تھا (دیکھیے: سلیم، سیّد محمد، ''مغربی زبانوں کے ماہر علماء''، لاہور: ادارۂ تعلیمی تحقیق، ۱۹۹۳ء، ص۵۹-۶۰) اور پھر فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کرایا گیا۔ مستشرق جیمز اینڈرسن ہملٹن (James Anderson Hamilton) کے قلم سے یہ ترجمہ پہلی بار ۱۷۹۱ء میں شائع ہوا، اس کا عکس لاہور سے بھی شائع ہوا ہے (۱۹۵۹ء)۔ یہ ترجمہ، جو

ہدایہ کے فارسی ترجمہ پر مبنی ہے، ناقص خیال کیا جاتا ہے۔ دیکھیے: علی، عبداللہ یوسف، ''انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ''، ص۹۱؛ میور، رمزے (Muir, Ramsay)، ۱۹۷۸ء، ص۱۵۱-۱۵۲؛ اکرام، ایس۔ایم، "History of Muslim Civilization in India and Pakistan"، لاہور: سٹار بک ڈپو، ۱۹۶۱ء، ص۴۱۰۔

(۲۳) ندوی، سیّد سلیمان، ''حیات شبلی''، ص۴۱۶۔

(۲۴) ایضاً، ص۱۳۵۔

(۲۵) ایضاً، ص۴۱۸۔

(۲۶) ایضاً، ص۴۱۸-۴۲۰۔

(۲۷) مجیب، ایم، "The Indian Muslims"، لندن: جارج ایلن اینڈ اَن وِن، ۱۹۶۷ء، ص۵۲۲-۵۲۳۔

(۲۸) ندوی، سید سلمان حسینی، ''ہمارا نصاب تعلیم کیا ہوا؟''، ص۱۲۳-۱۲۴۔

(۲۹) اسرار احمد، ''اسلام اور پاکستان: تاریخی، سیاسی، علمی اور ثقافتی پس منظر''، لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن، ۲۰۰۵ء، ص۷۶-۷۷۔

(۳۰) جدید مغربی تعلیم پر ڈاکٹر محمد اقبال کے تنقیدی خیالات و آرا کے بارے میں ملاحظہ ہو: ندوی، سیّد ابوالحسن علی، ''نقوشِ اقبال''، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۳ء، ص۸۵-۹۶۔

(۳۱) اقبال، علامہ شیخ محمد، ''ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر''(مترجمہ: ظفر علی خان)، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۹۴ء، ص۲۶-۲۷۔

(۳۲) اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد اقبال کا وہ خط بطورِ خاص قابل ذکر ہے جو انھوں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان کو (سیکرٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس و وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) تحریر کیا۔ اس خط میں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اعلیٰ پیمانے پر علومِ اسلامیہ کی تعلیم و تدریس اور فکر اسلامی (علم کلام و فقہ) کی تدوینِ جدید کے لیے مطلوبہ استعداد کے حامل ماہرین کی تیاری سے متعلق بڑی اہم تجاویز پیش کیں تھیں۔ ملاحظہ ہو: عبدالواحد، سیّد (مرتب)، "Thoughts and Reflections of Iqbal"، لاہور: شیخ محمد اشرف، ۱۹۹۲ء،، ص۱۰۳-۱۰۹۔

(۳۳) سالک، عبدالمجید، ''ذکرِ اقبال''، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۵۵ء، ص۲۱۱-۲۱۲۔ علامہ اقبال نے زمانۂ حال کی روشنی میں اسلام کے مطالعہ، اس کے عقائد و احکام کی تعبیر نو بالخصوص فقۂ اسلامی کی تشکیل جدید کی ضرورت و اہمیت کے متعلق متعدد مواقع پر اظہار خیال کیا ہے۔ محمد سعید الدین جعفری کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں: ''ایشیا کے قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی زمانہ حال کی روشنی میں مطالعہ کیے جانے کا محتاج ہے۔ پرانے مفسرینِ قرآن اور

دیگر اسلامی مصنفین نے بڑی خدمت کی ہے۔ مگر ان تصانیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جدید دماغ کو اپیل نہ کریں گی۔ میری رائے میں بہ حیثیت مجموعی زمانۂ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ حکماء میں ابن رشد اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ دیکھا جائے۔ علی ھذا القیاس غزالی اور رومی علیہم الرحمۃ، مفسرین میں معتزلی خیال سے زمخشری، اشعری خیال سے رازی اور زبان ومحاورہ کے اعتبار سے بیضاوی۔ نئے تعلیم یافتہ مسلمان اگر عربی میں اچھی دستگاہ پیدا کرلیں تو اسلام کے Re-interpretation تعبیر وتشریح نو میں بڑی مدد دے سکیں گے''۔ ملاحظہ ہو: معینی، سید عبدالواحد (مرتب) ''مقالات اقبال''، لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۸۸ء، ص ۳۷۳-۳۷۴۔ فکر اسلامی بالخصوص فقۂ اسلامی کی تشکیل جدید کے متعلق علامہ محمد اقبال کے خیالات اور ان کے تنقیدی جائزہ کے لیے دیکھیے: شیخ، عطاء اللہ، ''اقبال نامہ''، لاہور: شیخ محمد اشرف، ۱۹۴۵ء، حصہ اول، ص ۵۰-۵۱؛ وحیدالدین، سید، ''اسلامی فکر کی تشکیل اقبال کی نظر میں''، مشمولہ ضیاء الحسن فاروقی ومشیر الحق (مرتبین)، ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید''، نئی دہلی: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز- جامعۂ ملّیہ اسلامیہ، ۱۹۷۸ء، ص ۳۵۶-۳۶۴؛ نیازی، سید نذیر، ''الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید: خطبات اقبال ایک نظر میں'' مشمولہ ''اقبال'' (لاہور)، ۴۷: ۱-۳ (جنوری- جولائی ۲۰۰۰ء)، ص ۱۲۱-۱۳۷؛ عمر، محمد سہیل، ''خطباتِ اقبال نئے تناظر میں''، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء، ص ۸-۴۲۔

(۳۴) چودھری نیاز علی خان ۱۹۳۵ء میں محکمہ انہار سے بعہدۂ اسسٹنٹ انجینیئر ریٹائر ہونے کے بعد سے مجوزہ ادارے کے قیام کے لیے کوشاں ہوئے۔ اس مقصد سے انہوں نے جمال پور میں اپنی جائیداد کا کثیر حصہ وقف کردیا تھا۔ مجوزہ ادارے کے لیے کئی رہائشی مکانات اور ایک مسجد بنوادی تھی۔ ان چند مکانات اور مسجد پر مشتمل اس نئی بستی ہی کا نام ''دارالاسلام'' تھا۔ موصوف کے احوال وآثار اور تعلیمی سرگرمیوں نیز دارالاسلام کے بارے میں علماء ومشاہیر سے ان کی مراسلت کے بارے میں ملاحظہ ہو: اعظم، کے ایم، ''حیات سدید: بانی دارالاسلام چوہدری نیاز علی خاں''، لاہور: نشریات، ۲۰۱۰ء؛ ہاشمی وخالد (مرتبین)، ۱۹۹۵ء، ''خطوط مودودی-۲''، لاہور: منشورات، ۱۹۹۵ء، ص ۴۱؛ اختر، سفیر، ''بیاد سید مودودی'' لوہسر شرفو- واہ کینٹ: دارالمعارف، ۱۹۹۸ء ص ۱۲؛ نعمانی، مولانا محمد منظور، ''مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت''، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۹۷ء، ص ۲۷-۲۸؛ خان، سرمحمد یامین، ''نامۂ اعمال''، لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۷۰ء، ج ۲، ص ۸۱۳؛ سہارن پوری، مولانا سید محمد شاہد، ''حیاتِ شیخ: مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے احوال وآثار کا جامع تذکرہ''، سہارن پور- انڈیا: مکتبۂ یادگارِ شیخ، ۲۰۰۴ء، ج ۲، ص ۱۱۶-۱۱۷۔

(۳۵) دیکھیے: نیاز علی خان بنام سید ابوالاعلیٰ مودودی، محررہ ۱۵/اپریل ۱۹۳۶ء مشمولہ حجازی، اختر (مرتب)،

''دارالاسلام''، لاہور: ادارۂ ترجمان القرآن، ۱۹۹۵ء، ص ۲۹۔ دارالاسلام پٹھان کوٹ کی تعلیم اسکیم کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: گیلانی، سید اسعد، ۱۹۷۸ء، ''اقبال، دارالاسلام اور مودودی''، لاہور: اسلامی اکادمی، ۱۹۷۸ء ؛ قریشی، ریحانہ، ''دارالاسلام - ایک تحقیقی مطالعہ''، لاہور: اعلیٰ پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء؛ اختر، سفیر، ''بیادسید مودودی''، ص ۹-۲۶؛ ہاشمی و خالد (مرتبین)، ''خطوط مودودی-۲''۔

(۳۶) محمد اسد (Leopold Weiss) نے پولینڈ کے شہر Lvov جو کہ اس وقت سلطنت آسٹریا کا حصہ تھا، کے ایک یہودی ربّی خاندان میں (۱۹۰۰ء) میں آنکھ کھولی۔ خاندانی روایت کے مطابق یہودی علماء سے مقدس مذہبی کتب کی تعلیم حاصل کی۔ ویانا یونیورسٹی سے ادب، فلسفہ اور تاریخ کی تعلیم کے بعد وہ مشہور جرمن اخبار (Frankfurter Zeitung) کے مراسلہ نگار کے بطور مشرق وسطیٰ چلے (۱۹۲۲ء) آئے۔ عربی و اسلامی تہذیب وثقافت اور معاشرت کے مشاہدہ، اور اسلام کے عمیق مطالعہ کے بعد حلقہ بگوش اسلام (۱۹۲۶ء) ہوئے۔ قبول اسلام کے بعد کئی سال (۱۹۲۶۔۱۹۳۲ء) سرزمین حجاز میں مقیم رہے۔ اس دوران انھوں نے عربی زبان و ادب پر دسترس کے علاوہ علوم اسلامیہ میں درک حاصل کیا۔ مسجد نبوی میں درس حدیث سے استفادہ کیا۔ اسد، امام سید احمد سنوسی (لیبیا میں اطالوی استعمار کے خلاف مزاحمت کے قائد اور شمالی افریقہ کے مشہور صوفی سلسلہ ''السنوسیۃ'' کے پیشوا) اور مشہور نجدی عالم قاضی القضاۃ عبداللہ بلیہد کی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوئے۔ سلطان عبدالعزیز ابن سعود (م ۱۹۵۳ء) کے معتمد ومقرب خاص رہے۔ ۱۹۳۲ء میں برصغیر پاک و ہند چلے آئے جہاں ان کے حکیم الامت محمد اقبال اور سید ابوالاعلیٰ مودودی سے قریبی روابط قائم ہوگئے تھے۔ اسد نے عرفات پبلی کیشنز کے نام سے اپنا ذاتی مطبع (سری نگر ۱۹۳۵ء، لاہور ۱۹۳۶۔۱۹۳۹ء) بھی قائم کیا۔ جہاں سے انہوں نے بخاری شریف کے ترجمہ وشرح (بزبان انگریزی) کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ محمد مارماڈیوک پکتھال کے انتقال کے بعد مجلّہ ''اسلامک کلچر'' (حیدرآباد دکن) کے مدیر (۱۹۳۶ - ۱۹۳۸ء) بھی رہے۔ بعدازاں انہوں نے "Arafat : A Monthly Critique of Muslim Thought" کے نام سے اپنا انگریزی مجلّہ جاری (۱۹۴۶ء) کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ حکومت پنجاب کے قائم کردہ۔ Department of Islamic Reconstruction کے ناظم کے منصب پر فائز (۱۹۴۷ء۔ ۱۹۴۹ء) ہوئے۔ موصوف نے وزارت خارجہ میں مشرق وسطیٰ ڈویژن کے ناظم اعلیٰ ۱۹۵۰۔۱۹۵۱ء) کے طور پر مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے ساتھ پاکستان کے سیاسی و سفارتی روابط کے قیام میں سرگرم کردار ادا کرنے کے علاوہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے وزیر مدارالمہام (Minister Plenipotentiary) کے طور پر بھی خدمات انجام (۱۹۵۱ - ۱۹۵۲ء) دیں۔ اسد عرصہ چالیس سال تک مغرب میں اسلام کے ایک پرجوش اور صادق ومخلص سفیر کے طور پر سرگرم عمل رہنے کے بعد فروری ۱۹۹۲ء میں اس جہان فانی سے اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ عصر جدید میں احیائے اسلام، اسلامی

اصول و اقدار کی اساس پر اسلامی معاشرہ اور ریاست کی تشکیل نو، ان کی علمی وفکری سرگرمیوں کا بنیادی موضوع ہے۔ اسلامی فقہ و قانون، اسلام میں ریاست وحکومت کے بنیادی اصول۔ مغربی تہذیب وتمدن کی تنقید وتردید ،ترجمہ وتفسیر قرآن اور امام بخاری کی الجامع الصحیح کے انگریزی وترجمہ وتشریح جیسے متنوع موضوعات پرانہوں نے گرانقدر تصانیف (جو مغرب میں ''اسلام'' کے تعارف کا ایک انتہائی موثر وسیلہ بن گئی ہیں) یادگار چھوڑی ہیں۔ محمد اسد کے حالات زندگی، علمی وتصنیفی سرگرمیوں اور افکار وخیالات کے جائزہ کے لیے دیکھیے:

اسد، محمد، "The Road to Mecca"، لندن: Max Reinhardt، ۱۹۵۴ء، ص ۱-۲ و بمواضع کثیرہ؛ وہی مصنف، ۱۹۸۰ء، "The Road to Mecca"، جبرالٹر: دارالاندلس، ۱۹۸۰ء، "Postscript"، ص ۳۷۶-۳۸۰۔؛ وہی مصنف، "Islam at the Crossroads"، لاہور: شیخ محمد اشرف، ۲۰۰۷ء، ''پیش لفظ'' "Foreword"، ص ۱-۴؛ وہی مصنف، ''محمد اسد- بندۂ صحرائی: خودنوشت سوانح عمری، ۱۹۳۲-۱۹۹۲ء''، مترجمہ محمد اکرام چغتائی؛ رتھوین، ملائز، (Ruthven, Malise)، ستمبر ۱۹۸۱ء، "Muhammad Asad: Ambassador of Islam"، "Muhammad Asad: Ambassador of Islam"، مشمولہ "Arabia: The Islamic World Review"، شمارہ ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء)، ص ۵۹-۶۲؛ اعظم، کے. ایم، "Unforgetable Pakistani"، مشمولہ روزنامہ "The News" (لاہور)، یکم جولائی ۲۰۰۰ء، ص ۶؛ وندھاگر، گنتھر (Windhager, Gunther)، "Leopold Weiss alias Muhammad Asad: Von Galizien nach Arabien 1900-1927"، کولون (Koln- Weimar): Bohlau Verlag Wien، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۷-۱۷۹ و بمواضع کثیرہ؛ نواب، اسماعیل ابراہیم، ۲۰۰۰ء، "A Matter of Love: Muhammad Asad and Islam"، مشمولہ "Islamic Studies"، ۳۹:۲ (۲۰۰۰ء)، ص ۱۵۵-۲۳۲؛ ہوف مان، مراد ولفرئڈ، "Muhammad Asad: Europe's Gift to Islam"، مشمولہ "Islamic Studies"، ۳۹:۲ (۲۰۰۰ء)، ص ۲۳۳-۲۴۸؛ ہوف مان، مراد ولفرئڈ، "Diary of a German Muslim"، کولون: IB, Verlag Islamische Bibliothek، ۱۹۸۷ء، ص ۴۱-۴۳، ۵۰-۵۳، ۱۵۲-۱۵۳، ۱۶۸-۱۶۹، ۱۷۷-۱۷۹ و بمواضع کثیرہ؛ ہوف مان، مراد ولفرئڈ، ۱۹۹۳ء، "Islam: The Alternative"، ریڈنگ (یو کے): Garnet Publishing، ۱۹۹۳ء، ص ۹۱-۹۳؛ حسن، ظل الرحیم، "Muhammad Asad: Scholar and Visionary"، مشمولہ "Iqra"، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۲۵-۲۷؛ اعظم، کے۔ ایم، یکم جولائی ۲۰۰۰ء، "Unforegtable Pakistani"، ص ۶؛ اقبال، مظفر، "A Forgotten Pakistani"، مشمولہ روزنامہ "The News"، ۲۳ جون ۲۰۰۰ء، ص ۶؛ نصر، سید ولی رضا، "Mawdudi and the Making of Islamic Revivalism"، نیویارک: آکسفرڈ

یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۶ء، ص۱۲۷- ۱۲۸ ؛ سائمن، گنٹر کارل (Simon, Karl Gunter)، ۱۹۹۸ء، "Muhammad Asad and The Road to Mecca: Text of Muhammad Asad's Interview"، مترجمہ ایلما رتھ ہارڈر (Elma Ruth Harder)،مشمولہ "Islamic Studies" ، ۳۷: ۴ (۱۹۹۸ء)، ص۵۳۳- ۵۴۴ ؛ شریف، ایم اے، ۱۹۹۴ء، "Searching for Solace: A Biography of Abdullah Yusuf Ali"، اسلام آباد: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۴ء، ص۱۱۴-۱۱۵، خصوصا حاشیہ۳۴۔ مزید دیکھیے :ندوی، سید ابوالحسن علی، ۱۴۱۲ھ، ''المفکر الاسلامی المھتدی البارز محمد اسد'' ،مشمولہ''البعث الاسلامی''، ۳۷: ۴ (ذوالحجۃ ۱۴۱۲ھ)،ص۹۳ - ۹۶'' وہی مصنف. ''اسلامیات اورمغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین''، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۱ء، ص ۳۶ - ۳۸ ؛ حجازی ،اختر (مرتب)،''دارالاسلام''، ص۳۶۔۴۳، ۱۴۴۔ ۱۴۵، ۷۲۔۷۳، ۷۷۔ ۷۹؛ صولت ، ثروت، جولائی ۱۹۹۲ء، ''علامہ محمد اسد مرحوم''، در ماہنامہ''نوائے اسلام'' (دہلی)، (جولائی ۱۹۹۲ء)، ص۳۰۔۳۶؛ حیدر، خواجہ رضی، ''قائداعظم خطوط کے آئینہ میں'' کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۵ء، ص ۴۲۹۔۴۳۱؛ خان، ایچ۔بی، ۱۹۷۶ء، ''شاہراہ مکہ''، کراچی: نورسی پبلیکیشنز، ۱۹۷۶ء، خصوصاً، باب چہارم (محمد اسد کے حالات)، ص ۱۰۲۔۱۴۹؛ اختر ،محمد کلیم ،'' علامہ محمد اسد اور علامہ محمد اقبال'' ،مشمولہ''نوائے وقت''، لاہور، ۵ مئی ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۳۔۱۱۳ ؛ وہی مصنف،'' اقبال اور مشاہیر کشمیر''، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص۱۰۳-۱۱۳؛ سعید، احمد ،'' اسلامیہ کالج لاہور کی صد سالہ تاریخ''، لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص۲۴۰-۲۴۲۔ نیازی، سید نذیر،''اقبال کےحضور''، کراچی: اقبال اکادمی، ۱۹۷۱ء، ص۳۸۳ - ۳۸۷ ؛ وہی مصنف (مرتب)،'' مکتوباتِ اقبال''، کراچی: اقبال اکادمی، ۱۹۵۷ء، ص۱۶۱، ۱۷۴-۱۷۵، ۱۷۸-۱۷۹ وبمواضع کثیرہ۔

(۳۷) نیازعلی خان بنام سید ابوالاعلی مودودی، محررہ ۸ مارچ ۱۹۳۷ء مشمولہ حجازی، اختر (مرتب)،'' دارالاسلام''، ص۴۳؛ نیازعلی خان بنام سید ابوالاعلی مودودی، محررہ ۱۰/ اپریل ۱۹۳۷ء مشمولہ حجازی، اختر (مرتب)،'' دارالاسلام''، ص ۵۱-۵۲۔

(۳۸) مولانا احمدعلی لاہوری، (۱۵/اگست، ۲۱/ نومبر، ۲۱/ دسمبر ۱۹۳۰ء، ۱۵/فروری، ۳۱/ مئی ۱۹۳۱ء، ۸/جون ۱۹۳۴ء) ابنِ شیخ حبیب اللہ (پیدائش: ۲۵/ مئی ۱۸۸۶ء- ۱۸۸۷ء)، وفات: لاہور ۲۳/فروری ۱۹۶۲ء۔

مولانا احمدعلی نے دارالارشاد نواب شاہ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں تدریس کا آغاز کیا۔ بعدازاں لاہور منتقل ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں لاہور کی خلافت کمیٹی کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کے زیرِ اثر ۱۹۲۱ء میں کابل ہجرت کی۔ ۱۹۲۲ء میں لاہور میں انجمنِ خدّام الدّین کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۲۴ء میں مدینہ قاسم العلوم قائم کیا۔ جمعیۃ العلمائے پاکستان کے صدر بھی رہے۔ آپ مولانا عبیداللہ سندھی کے ربیب تھے، یعنی مولانا احمدعلی کے والد

کے انتقال کے بعد ان کی والدہ نے نکاحِ ثانی مولانا عبیداللہ سندھی سے کیا تھا۔ مولانا کی ساری تعلیم و تربیت مولانا سندھی نے کی۔ مولانا سندھی کے قائم کردہ مدرسہ دارالارشاد میں تعلیم حاصل کی اور جب مولانا سندھی دیوبند اور پھر دہلی میں رہے تو اس مدرسے کا انتظام مولانا احمد علی کرتے رہے، بعد میں مولانا سندھی نے مولانا احمد علی کو دہلی بلالیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں تحریکِ ریشمی رومال سے تعلق کی بنا پر نظر بند کیے گئے، اور اس سلسلے میں راہواں (جالندھر) دہلی، شملہ اور لاہور میں حوالات میں رکھے گئے۔ ۱۹۱۷ء میں رہائی ملی تو لاہور میں مسجد لائن سبحان خان میں درسِ قرآن شروع کیاں۔ اس درس سے بلامبالغہ ہزاروں افراد مستفید ہوئے۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں انجمنِ خدّام الدّین قائم کی۔ یہ انجمن آج تک دینِ اسلام کی خدمت کررہی ہے۔ مولانا احمد علی کی متعدد دینی و علمی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں ''خطباتِ جمعہ'' اور ''مجلسِ ذکر کے مواعظ'' کی آٹھ آٹھ جلدیں بھی شامل ہیں۔ قرآن شریف کا ترجمہ مع حواشی بھی کیا ہے جو ''قرآنِ عزیز'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مولانا احمد علی ایک روشن خیال اور ایمانی فراست سے بہرہ مند عالم تھے۔ وہ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں دعوت وتبلیغ کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس غرض سے انھوں نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں انجمنِ خدام الدین کے زیرِ اہتمام ایک انگریزی پرچہ ''اسلام'' کے نام سے جاری کیا۔ جس کی ادارت کی ذمہ داری خواجہ عبدالوحید انجام دیتے رہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: ندوی، سید ابوالحسن علی، س۔ن، ''پرانے چراغ''، کراچی: مجلس نشریات اسلام، س۔ن، حصہء اول، ص۱۳۴-۱۶۳۔ مزید دیکھیے: خان، عبدالحمید، س۔ن، ''مردِ مؤمن''، لاہور: مکتبہ خدّام الدّین، س۔ن؛ انگر، لال دین، ''سوانح حیات سید العارفین شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری''، لاہور: مکتبہ خدّام الدّین، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء؛ عبدالوحید، خواجہ، ۲۰۰۵ء، ''یادِ ایام روزنامچہ''، جریدہ (۳۳)، غیر مطبوعہ کتابیں نمبر، جلد ۵ (کراچی)، ص۳۵۲-۳۵۴ و بمواضع عدیدہ۔

(۳۹) غیر مطبوعہ، مملوکہ شاہ امین عطا، لاہور۔ مذکورہ خط شبلی اکیڈمی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ یو، پی کے لیٹر پیڈ پر- حیدر آباد دکن توپ کا سانچہ نمبر ۱۱۴۱ سے لکھا گیا۔

(۴۰) غیر مطبوعہ، مملوکہ شاہ امین عطا، لاہور۔

(۴۱) چودھری نیاز علی خان اور سید ابوالاعلی کے مابین مرسلت کی تفصیل کے لیے دیکھیے: ہاشمی، رفیع الدین وسلیم منصور خالد (مرتبین)، ''خطوط مودودی-۲''، ص۴۱-۱۶۹؛ حجازی، اختر (مرتب)، ''دارالاسلام''، ص۲۷-۱۰۷۔

(۴۲) ہاشمی وخالد، ''خطوط مودودی-۲''، ص۵۹-۶۷۔

(۴۳) ایضاً، ص۶۹-۷۰۔

(۴۴) ایضاً، ص۷۳۔

(۴۵) ایضاً، ص۸۴۔

(۴۶) علامہ سید سلیمان ندوی نے اسد کی مذکورہ تصنیف کی اشاعت پر معارف (اعظم گڑھ) میں اپنے ادارتی شذرات میں لکھا: ''ہم کو اپنے تمام نومسلم بھائیوں میں سب سے زیادہ جس کی شخصیت نے متاثر کیا ہے، وہ آسٹریا کے ایک گمنام نومسلم لیوپولڈ ویئس معروف بہ محمد اسد ہیں..... چند ماہ ہوئے کہ موصوف نے اپنی ایک مختصر لیکن جامع کتاب ''اسلام آن دی کراس روڈ (اسلام راہ عبور پر)'' بزبان انگریزی شائع کی ہے۔ اس میں موجودہ حالات و خیال کے پیش نظر اسلام کی تعلیم کو بطور نجات پیش کیا ہے، اس ضمن میں یورپ کے تمدن اور رجحانات دماغی کی تنقید کی ہے۔ بعض مسلمانوں میں اس وقت یورپین تجدد اور احادیث نبویہ سے روگردانی کی بدعتوں کو اصلاح (Reformation) کے نام سے پیش کرنے کی جو افراط وتفریط پیدا ہو رہی ہے اس کی غلطیاں نہایت صحت اور نکتہ سنجی کے ساتھ ظاہر کی ہیں۔ کتاب کے اس باب The Spirit of Sunnah و Hadith and Sunnah کو پڑھ کر اپنے ان نئے خیال دوستوں کو حافظ کا یہ شعر سنانے کو جی چاہتا ہے:

حسن ز بصرہ ، بلال از حبش ، صہیب از روم
زخاک مکہ ابوجہل ، ایں چہ بوالعجبی است

ملاحظہ ہو: ''معارف'' (اعظم گڑھ)، ۳۴: ۴ (اکتوبر ۱۹۳۴ء)، ص ۲۴۲-۲۴۳۔ سید سلیمان ندوی نے عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط محرّرہ ۳۰ جولائی ۱۹۳۴ء میں لکھا: ''جی ہاں جرمن نومسلم محمد اسد سے پورا واقف ہوں یہ مسلمانوں سے بڑھ کر مسلمان ہے''۔ ملاحظہ ہو: دریابادی، مولانا عبدالماجد (مرتب)، ''سید سلیمان ندوی کے خطوط عبدالماجد دریا آبادی کے نام''، کراچی: نفیس اکیڈیمی، ۱۹۸۶ء، حصہ دوم، ص ۳۷۔

(۴۷) برّعظیم میں قیام کے دوران میں محمد اسد کا جس شخصیت سے سب سے گہرا تعلق قائم ہوا وہ علامہ محمد اقبال تھے۔ اسد کا ۱۹۳۲ء میں لاہور میں قیام کے ابتدائی دنوں میں علامہ محمد اقبال سے جو نیازمندانہ تعلق استوار ہوا وہ ان کی وفات تک برابر قائم رہا۔ اسد علامہ کی زندگی کے آخری سالوں میں تو ان کے حلقۂ خواص میں شامل ہو گئے تھے۔ الٰہیاتِ اسلامیہ اور فقۂ اسلامی کے بارے میں دونوں کے مابین بحث وگفتگو رہتی تھی (اسد، محمد، ''بندۂ صحرائی: محمد اسد- خود نوشت سوانح عمری''، مترجمہ محمد اکرام چغتائی، لاہور: دی ٹروتھ سوسائٹی، ۲۰۰۸ء، ص ۵۸-۶۴)۔ محمد اسد شمالی افریقہ کی سنوسی تحریک کے تیسرے اور آخری امام سیدی احمد الشریف کے بعد جدید دنیائے اسلام کی جس شخصیت سے سب سے زیادہ متأثر ہوئے وہ علامہ محمد اقبال تھے۔ وہ علامہ اقبال کے خیالات وافکار اور ان کے شعر وفن کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ علامہ محمد اقبال اس زیرک وجری نومسلم کے جذبۂ اسلامیت کی بڑی قدر کرتے تھے۔ سید نذیر نیازی کے بقول، جو اکثر مواقع پر علامہ محمد اقبال اور محمد اسد کے درمیان پیغام رسانی اور رابطہ کا ذریعہ رہے تھے، ''حضرت علامہ نے ان (اسد) کی تصنیف "Islam at the Crossroads" کو پسند فرمایا تھا''، (دیکھیے: نیازی، نذیر، (مرتب)، ''مکتوبات اقبال''، کراچی: اقبال

اکادمی، ۱۹۵۷ء، ص ۱۵۹، حاشیہ ۱۲)۔ ڈاکٹر محمد اقبال اسے علمی وفکری کاموں کے لیے تحریک بھی کرتے رہے (ملاحظہ ہو: اسد، محمد، "The Road to Mecca"، لندن: Max Renhardt، ۱۹۵۴ء، ص ۲-۳؛ وہی مصنف، ۱۹۳۵ء، "Sahih al-Bukhari"، سرینگر: عرفات پبلی کیشنز، ۱۹۳۵ء، ج ۱، ص ۷؛ سائمن (Simon)، "Muhammad Asad"، سائمن، گنٹر کارل (Simon, Karl Gunter)، ۱۹۹۸ء، "Muhammad Asad and The Road to Mecca: Text of Muhammad Asad's Interview" مترجمہ ایلما رتھ ہارڈر (Elma Ruth Harder)، مشمولہ "Islamic Studies"، ۳۷:۴ (۱۹۹۸ء)، ص ۵۳۹)۔ دونوں کے مابین دنیائے اسلام کو درپیش اہم مسائل وتحدیات پر، خصوصاً فقہ و علم الکلام کے تشکیل نو سے متعلق گفتگو رہتی (دیکھیے: اسد، محمد، ''بندۂ صحرائی: محمد اسد-خودنوشت سوانح عمری''، مترجمہ محمد اکرام چغتائی، ص ۸۱-۸۲)۔ محمد اسد، ملک محمد اشرف (۱۹۱۵-۱۹۸۱ء) کے نام ایک خط محررہ ۱۷ جون ۱۹۴۶ء، از ڈلہوزی، میں لکھتے ہیں:

"I cannot say anything about Iqbal as a poet. I know him well, but almost all our conversations were concerned with Islamic theology and jurisprudence".، (غیر مطبوعہ، مملوکہ راقم)۔

علامہ محمد اقبال کے بعض خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسد کے مسائل ومعاملات میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتے رہے۔ علامہ سید نذیر نیازی کے نام ایک خط میں، رقم طراز ہیں:

''معلوم نہیں محمد اسد کیا کرتے ہیں۔ شاید وہ کوئی انگریزی اخبار یا رسالہ نکالنے والے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ان کو کہیں دینیات یا عربی زبان کا پروفیسر کردیا جائے۔ ان کی انگریزی کتاب "Islam at the Crossroads" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دین اسلام کے اسرار سے ناواقف نہیں۔ اگرچہ اُن کے Pessimism (قنوطیت) سے مجھے اتفاق نہیں۔'' (دیکھیے: نیازی، سید نذیر (مرتب)، ''مکتوبات اقبال''، ص ۱۶۱)۔ اس ضمن میں اسلامیہ کالج لاہور میں اسد کے بطورِ پروفیسر عربی و اسلامیات تقرر کا معاملہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔ ۱۹۳۳ء میں اسلامیہ کالج لاہور کی کمیٹی نے علامہ اقبال، جو بطورِ صدر انجمن حمایت اسلام کالج کے سرپرست اعلیٰ بھی تھے، کی تحریک پر طلبہ کی دینی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کرنے کا فیصلہ کیا (دیکھیے: ''روئداد اجلاس جنرل کونسل''، منعقدہ ۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء، ص ۲-۳)۔ چنانچہ علامہ ہی کے مشورے سے سال اوّل سے سال چہارم کے طلبہ کے لیے دینی تعلیم کا نصاب بھی مرتب کیا گیا۔ کالج کمیٹی کو دینیات کی تدریس کے لیے ایک ایسے عالم و فاضل کی ضرورت تھی جو اعلیٰ پائے کا عالم وخطیب ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی دان بھی ہو اور دوسرے مذاہب سے بھی واقفیت رکھتا ہو (سعید، احمد، ''اسلامیہ کالج لاہور کی صد سالہ تاریخ''، حصہ دوم، ص ۲۳۸-۲۴۰)۔ علامہ محمد اقبال نے بطور صدر انجمن حمایت اسلام کالج کمیٹی کو دینیات وعربی کے پروفیسر کے لیے محمد اسد کا نام

تجویز کیا اور ساتھ ہی از خود محمد اسد سے رابطہ کر کے انہیں کالج میں بطور استاد تقرر پر آمادہ کرلیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نیازی، نذیر (مرتب)، ''مکتوبات اقبال''، ص ۱۶۱، ۱۷۴، ۱۷۵-۱۷۸، ۱۷۹-۱۷۸ و بمواضع کثیرہ)۔ اسد نے علامہ کے نام ایک خط میں اسلامیہ کالج میں تدریسِ اسلامیات کے منصوبے کو ایک عمدہ تجویز قرار دیا اور بطور استاد تقرر کے لیے اپنی رضامندی سے آگاہ کیا۔ اسد نے دینیات کے نصاب کے بارے میں کچھ تجاویز بھی پیش کیں اور اسلامیہ کالج کو شمالی ہندوستان میں اسلامیات کی تدریس کا ایک اہم مرکز بنانے سے متعلق اپنے ارادوں کا ذکر کیا۔ وہ (اسد) اسلامیہ کالج میں اسلامیات کے شعبہ کو مغربی ممالک کی جامعات میں مختلف ادیان و مذاہب کی تدریس و تحقیق کے لیے قائم شعبوں جیسا اعلیٰ معیار کا ادارہ بنانا چاہتے تھے (محمد اسد بنام علامہ محمد اقبال، محررہ ۱۲ جولائی ۱۹۳۴ء، از دہلی۔ یہ خط ''روئداد اجلاس جنرل کونسل''، منعقدہ ۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء، ص ۱۰-۱۲، میں نقل کیا گیا ہے۔ ایم. اے. شریف نے علامہ سید عبداللہ یوسف علی کی سوانح حیات (بزبان انگریزی) میں بھی اس خط کو نقل کیا ہے، دیکھیے: شریف، ۱۹۹۴ء، "Searching for Solace: A Biography of Abdullah Yusuf Ali"، ص ۱۱۴-۱۱۵، حاشیہ ۳۴)۔ اسلامیہ کالج کی جنرل کونسل نے ۱۹۳۴ء کے وسط میں کالج کمیٹی کی سفارش پر محمد اسد کی اسلامیات وعربی کے پروفیسر کے بطور تقرر کی منظوری دے دی۔ کالج کمیٹی نے ان کی تنخواہ مقرر کرنے کا حتمی اختیار کالج کے سرپرست اعلیٰ علامہ اقبال کو دے دیا۔ علامہ نے آزمائشی طور پر عرصہ چھ ماہ کے لیے ۲۵۰ روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی (نیازی، نذیر (مرتب)، ''مکتوبات اقبال''، ص ۱۷۹)۔ اسد نے اسی تنخواہ پر تقرر اس شرط پر منظور کرلیا کہ عرصہ چھ ماہ بعد تنخواہ تین سو روپے ماہوار کردی جائے گی (محمد اسد بنام علامہ محمد اقبال، محررہ ۳۱ جولائی ۱۹۳۴ء، مشمولہ ''روئداد اجلاس جنرل کونسل''، منعقدہ یکم اگست ۱۹۳۴ء، ص ۲۷-۲۹۔ مزید دیکھیے: شریف، "Searching for Solace"، اسلام آباد: ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۵)۔ اگرچہ کالج کمیٹی نے اسد کی اس شرط کو تسلیم کرلیا تھا اور بطور پروفیسر اسلامیات ان کے تقرر کی باضابطہ طور پر منظوری دے دی تھی (دیکھیے: ''روئداد اجلاس جنرل کونسل''، منعقدہ یکم اگست ۱۹۳۴ء، ص ۲۷-۲۹؛ سعید، احمد، ''اسلامیہ کالج کی صد سالہ تاریخ''، ص ۲۴۰-۲۴۲) ۔ تاہم انہوں نے بخاری شریف کے انگریزی زبان میں ترجمہ کی مشغولیت کو اسلامیہ کالج میں تدریسی ذمہ داریاں سنبھالنے پر ترجیح دی۔ اسد کے ایک خط بنام چودھری نیاز علی خان (م:۱۹۷۶ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامیہ کالج میں تدریس اسلامیات کی اسکیم سے کامل طور سے مطمئن نہ تھے مزید برآں وہ ترجمہ وشرح بخاری بزبان انگریزی کو دیگر تمام مشاغل ومصروفیات پر مقدم رکھنا چاہتے تھے (محمد اسد بنام نیاز علی خان، محررہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۵ء، از سری نگر؛ ۱۸ نومبر ۱۹۳۶ء، از ماڈل ٹاؤن، لاہور)۔ نصاب کمیٹی نے طلبہ کو عقائد وفقہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے چند پاروں کی ترجمہ کے ساتھ تدریس کے علاوہ سیرت النّبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کو نصاب میں شامل کیا تھا۔ جب کہ اسد روایتی طرز کی فقہی تعلیم کے علاوہ تاریخ تشریع اسلامی کی اس طور سے تدریس چاہتے تھے کہ طلبہ کو حالات و زمانہ

کے تغیّر کے ساتھ ساتھ شرعی احکام ومسائل میں تبدیلی کا فلسفہ وحکمت ذہن نشین ہو سکے۔ اسد دراصل فقہ میں تقلید کے سخت خلاف اور اجتہاد کے پر جوش داعی وحامی تھے اور اس طرز فکر کو طلبہ تک منتقل کرنا چاہتے تھے (ملاحظہ ہو: محمد اسد بنام علامہ محمد اقبال، محررہ ۱۲ جولائی ۱۹۳۴ء، مشمولہ ''روئداد اجلاس جنرل کونسل''، منعقدہ ۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء، ص ۱۰-۱۲)۔ علامہ محمد اقبال سے محمد اسد کے تعلقات وروابط کے لیے مزید دیکھیے: اختر، کلیم، ''علامہ محمد اسد اور علامہ محمد اقبال'' مشمولہ روزنامہ ''نوائے وقت'' (لاہور)، ۵ مئی ۱۹۹۲ء، ادارتی صفحہ؛ وہی مصنف، ''اقبال اور مشاہیر کشمیر''، ص ۱۰۳-۱۱۳؛ رضوی، خورشید، ''سید نذیر نیازی سے ایک مکالمہ'' سہ ماہی اقبال (لاہور)، ۴۷: ۱-۳ (جنوری-جولائی ۲۰۰۰ء)، ص ۸۶-۸۷؛ برنی، مظفر حسین (مرتب)، ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال''، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء، ج ۳، ص ۵۳۱ -۵۹۷؛ نیازی، نذیر، ''اقبال کے حضور''، ص ۳۸۳-۳۸۷؛ نیازی، سید نذیر (مرتب)، ''مکتوبات اقبال''، ص ۱۶۱، ۱۷۴-۱۷۵، ۱۷۸-۱۷۹، ۱۸۷؛ محمد اسد بنام ملک محمد اشرف (۱۹۱۵-۱۹۸۱ء)، محررہ ۱۷ جون ۱۹۴۶ء، از ڈلہوزی، غیر مطبوعہ، مملوکہ راقم۔

(۴۸) محمد اسد بنام نیاز علی خان، محررہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۵ء، از سری نگر-کشمیر، غیر مطبوعہ، مملوکہ راقم۔ خط کے اردو ترجمہ کے لیے دیکھیے: اعظم، کے ایم، ''حیاتِ سدید''، ص ۶۱-۶۳۔

(۴۹) محمد اسد بنام نیاز علی خان، محررہ ۱۸ نومبر ۱۹۳۶ء، از ماڈل ٹاؤن، لاہور، غیر مطبوعہ، مملوکہ راقم۔ اس خط کے اردو ترجمہ کے لیے دیکھیے: کے ایم اعظم، حیات سدید، ص ۶۴-۶۷۔

(۵۰) نیاز علی خان نے سید مودودی کے نام ایک خط میں لکھا تھا: ''میں نے اپنے ایک مجوزہ ادارے کے لیے جناب سے مشورہ کیا تھا، اب میں اراضی وقف پر مکانات تعمیر کر رہا ہوں اور اس ادارہ کے متعلق چند بزرگوں سے بات چیت کی ہے..... مولانا محمد اسد، جرمن نومسلم، جو حیدر آباد کی طرف سے رسالہ ''مسلم (کذا)، اسلامک کلچر'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں، انھوں نے میرا شریک کار ہونا منظور کر لیا ہے۔ میں نے ان سے ذکر کیا تھا۔ ان کو بھی جناب کی ذات والا صفات سے بہت عقیدت ہے''۔ ملاحظہ ہو: حجازی (مرتب)، ''دارالاسلام''، مکتوب نمبر ۶، ص ۳۵-۳۶۔

(۵۱) سید مودودی بنام نیاز علی خان، محررہ ۱۹ رمضان المبارک، ۱۳۵۵ھ، مشمولہ حجازی (مرتب)، ''دارالاسلام''، ص ۳۸؛ ہاشمی و خالد (مرتبین)، ''خطوط مودودی-۲''، ص ۵۶-۵۷۔

(۵۲) محمد اسد بنام نیاز علی خان، محررہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۵ء، از سری نگر؛ ۱۸ نومبر ۱۹۳۶ء، از ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ مزید ملاحظہ ہو: حجازی (مرتب)، ''دارالاسلام''، مکتوب ۸، ص ۴۲-۴۳۔

(۵۳) محمد اسد بنام نیاز علی خان، محررہ ۱۸ نومبر ۱۹۳۶ء، از ماڈل ٹاؤن، لاہور، غیر مطبوعہ، مملوکہ راقم۔ اس خط کے اردو ترجمہ کے لیے دیکھیے: اعظم، کے ایم، ''حیاتِ سدید''، ص ۶۴-۶۷۔

(۵۴) نیازعلی خان بنام سیدمودودی (محررہ ۸ مارچ ۱۹۳۷ء) رقم طراز ہیں: ''مولانا اسد یہاں (جمال پور، پٹھان کوٹ) آ کر کئی روز قیام کر گئے ہیں وہ یہاں اپنا گھر بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اس ادارہ کو اپنی تالیف وتصانیف سے جو وقت بچے، دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ مگر ابھی تک وہ مالی معاملات سے متعلق پریشان ہیں......علامہ محمد اقبال میری اس تجویز (منصوبے) سے بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ بلکہ ان کے خیالات تو بہت بلند ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس ادارہ کو ان شاء اللہ ایسا بنائیں گے کہ اس کا اثر یورپ تک پہنچے گا''، ملاحظہ ہو: حجازی (مرتب)، ''دارالاسلام''، مکتوب ۸، ص ۴۳۔ چودھری نیازعلی خان سے محمد اسد کے روابط نیز دارالاسلام، جمال پور-پٹھان کوٹ میں ان کے قیام کے بارے میں دیکھیے: اسد، محمد، ''بندۂ صحرائی: محمد اسد-خودنوشت سوانح عمری''، مترجمہ محمد اکرام چغتائی، ص ۷۸-۸۰۔

(۵۵) ملاحظہ ہو: نیازعلی خان بنام سید مودودی، محررہ ۸ مارچ ۱۹۳۷ء، و ۲۶/اپریل ۱۹۳۷ء، مشمولہ حجازی (مرتب)، ''دارالاسلام''، ص ۴۳-۴۴، ۵۵-۵۶۔

(۵۵ب) برنی، سیدمظفرحسین (مرتب)، ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال''، جلد۴، ص ۵۱۳۔۵۱۵۔

(۵۶) ہاشمی، عبداللہ شاہ (مرتب)، ''اقبالیاتِ سیدنذیر نیازی''، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۳-۱۰۴۔ مزید دیکھیے: رحیم بخش شاہین، ''اوراقِ گم گشتہ''، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء، ص ۸۱-۸۲؛ خورشید، عبدالسلام، ''سرگزشتِ اقبال'' لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۶ء، ص ۳۹۲۔

(۵۷) نیازعلی خان بنام سیدمودودی، محررہ ۱۶، اپریل ۱۹۳۷ء؛ ۵ مئی ۱۹۳۷ء، مشمولہ حجازی (مرتب)، ''دارالاسلام''، ص ۵۵، ۶۰۔

(۵۸) مصطفیٰ المراغی کے افکار و خیالات کے لیے ملاحظہ ہو: الرومی، فھد بن عبدالرحمٰن بن سلیمان، ''منهج العقلية الحديثة فی التفسير''، الریاض: مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۰۷ھ، ص ۱۸۸-۱۹۳؛ مزید ملاحظہ ہو: ایڈمز، چارلس سی، "Islam and Modernism in Egypt"، لندن: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۳۳ء، ص ۲۰۸-۲۰۹۔

(۵۹) گیلانی، سیداسعد، ''اقبال، دارالاسلام اور مودودی''، ص ۹۶، ۱۵۷-۱۵۸، ۳۰۲؛ اختر، سفیر، ''بیادِ سیدمودودی''، ص ۱۳۔

(۶۰) ملاحظہ ہو: اقبال کے علامہ مصطفیٰ المراغی کے نام خط کے متن کے لیے ملاحظہ ہو: عطاء اللہ، ''اقبال نامہ''، حصہ اول، ص ۲۵۱-۲۵۳؛ سالک، عبدالمجید، ''ذکرِ اقبال''، ص ۲۱۳-۲۱۴۔

(۶۱) ملاحظہ ہو: گیلانی، سید اسعد، ''اقبال، دارالاسلام اور مودودی''، ص ۸۳، ۹۶۔ مصطفیٰ المراغی کے خط بنام ڈاکٹر محمد اقبال کے لیے دیکھیے: ہاشمی، رفیع الدین (مرتب)، ۱۹۷۶ء، ''خطوطِ اقبال''، لاہور: خیابانِ ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۲۸۸؛ اختر، سفیر، ''بیادِ سیدمودودی''، ص ۱۴-۱۵۔

(۶۲) سید محمد شاہ علامہ اقبال کے بڑے عقیدت مند تھے۔ انہوں نے تعلیمات و افکار اقبال کے فروغ کے لیے جولائی ۱۹۳۶ء میں پٹھان کوٹ سے ماہنامہ ''پیغام حق'' جاری کیا اور ۱۹۳۹ء میں اقبال اکیڈمی، لاہور قائم کی۔ وہ ادارۂ دارالاسلام کے تأسیسی رکن تھے۔ جماعت اسلامی کے قیام کے بعد رسالہ ''ترجمان القرآن'' اور مکتبہ کا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ وہ ۲۲ نومبر ۱۹۴۲ء کو جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے، ملاحظہ ہو: ہاشمی، رفیع الدین و سلیم منصور خالد (مرتبین)، ۱۹۸۳ء، ''خطوط مودودی''، لاہور: البدر پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء، ص ۸۹، حاشیہ ۳۔

(۶۳) دیکھیے: حجازی (مرتب)، ''دارالاسلام''، ص ۴۳۔

(۶۴) نیاز علی خان نے سید مودودی کے نام ایک خط (محرّرہ ۷ جون ۱۹۳۷ء) میں لکھا: ''مولانا محمد اسد صاحب چند روز سے یہاں (جمال پور) تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ان کا خط آپ کے نام اس خط میں ہے''۔ دیکھیے: حجازی (مرتب)، '' دارالاسلام''، ص ۶۸۔ نیاز علی خان سید مودودی کے نام ایک دوسرے خط (محرّرہ ۱۸ جولائی ۱۹۳۷ء) میں لکھتے ہیں: ''محمد اسد آپ کو خود اپنی قربت کی دعوت دے چکے ہیں۔ سید محمد شاہ آپ کی خدمت و رفاقت کے لیے آمادہ ہیں۔ میرا اب خیال ہے کہ ان تین ارکان محمد اسد، سید محمد شاہ اور سید مودودی کی تقرری کا حکم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہو چکا ہے''۔ ملاحظہ ہو: حجازی (مرتب)، ''دارالاسلام''، ص ۴۷۔

(۶۵) ملاحظہ ہو: حجازی (مرتب)، ''دارالاسلام''، ص ۴۳، ۵۷، ۷۷، ۷۹، ۸۱، ۱۴۱؛ اختر، سفیر، ''بیاد سید مودودی''، ص ۱۸؛ شاہین، رحیم بخش، ''اوراقِ گم گشتہ''، ص ۹۱۔

(۶۶) اختر، سفیر، ''بیاد سید مودودی''، ص ۱۸۔

(۶۷) قرشی، افضل حق، ''نادرات اقبال''، مشمولہ ''صحیفہ'' (اقبال نمبر، حصہ اوّل)، شمارہ ۶۵ (اکتوبر ۱۹۷۳ء)، ص ۲۲۹-۲۳۰

(۶۸) اختر، سفیر، ''بیاد سید مودودی''، ص ۱۸-۲۰؛ قرشی، افضل حق، ''نادرات اقبال''، ص ۲۳۰-۲۳۱۔

(۶۹) قریشی، ریحانہ، '' دارالاسلام ''، ص ۲۴، ۶۱۔

(۷۰) سید مودودی کے مرتب کردہ ان توضیحی مقاصد اور ''نظام نامہ دارالاسلام'' کے لیے دیکھیے: حامدی، مولانا خلیل احمد، '' وثائق مودودی'' لاہور: ادارۂ معارفِ اسلامی، ۱۹۸۴ء، ص ۸۴-۸۵؛ حجازی (مرتب)، ''دارالاسلام''، ص ۱۳۳-۱۵۶؛ قریشی، ریحانہ، '' دارالاسلام''، ص ۳۰-۴۶۔ سید مودودی نے دارالاسلام کے اغراض و مقاصد کی توضیح اپنی متعدد تحریروں میں کی ہے، بطور مثال دیکھیے: فاروقی، ابو راشد، ''اقبال اور مودودی''، لاہور: مکتبۂ تعمیر انسانیت، ۱۹۸۰ء، ص ۹۷-۱۲۴۔

(۷۱) حجازی (مرتب)، '' دارالاسلام''، ص ۱۵۵-۱۵۶۔

(۷۲) اجلاس میں شرکت کے لیے جن علماء کو دعوت دی گئی تھی ان میں سید مناظر احسن گیلانی (م: ۱۹۵۶ء)، سید سلیمان ندوی (م: ۱۹۵۳ء)، مفتی کفایت اللہ (م: ۱۹۵۲ء)، مولانا احمد سعید (م: ۱۹۶۰ء)، مولانا احمد علی لاہوری (م:

۱۹۶۲ء) اور مولانا امین احسن اصلاحی (م: ۱۹۹۷ء) بھی شامل تھے۔ تاہم وہ نہ تو خود شریک ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اپنی آراء بصورت تحریر ارسال کیں۔ دیکھیے: حجازی (مرتب)،''دارالاسلام'، ص ۱۵۶-۱۵۸۔

(۷۳) تفصیل کے لیے دیکھیے: گیلانی، اسعد،'' اقبال، دارالاسلام اور مودودی'' ؛ قریشی، ریحانہ،''دارالاسلام-ایک تحقیقی جائزہ''، ص ۵۱-۸۵؛ حجازی (مرتب)،'' دارالاسلام''، ص ۳۰۷-۳۲۰؛ اعظم، کے ایم،''حیاتِ سدید''، خصوصاً ص ۳۴۴۔ ۵۶۱؛ صدیقی، رحمٰن، ''مولانا ابوالکلام آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مستری صاحب''، لاہور: محمد حمید احمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳۵۔۱۵۰۔ مزید دیکھیے: نصر، سید ولی رضا، "Mawdudi and the Making of Islamic Revivalism"، نیویارک: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۷-۱۲۸۔

(۷۴) نیاز علی خان بنام سید مودودی، مشمولہ حجازی (مرتب)،'' دارالاسلام''، ص ۴۳، ۶۸؛ صدیقی، نعیم،''علامہ محمد اسد مرحوم''، مشمولہ ہفت روزہ ''زندگی'' (لاہور)، ۱۳: ۳،۲ (۴ تا ۱۷ اپریل ۱۹۹۲ء)، ص ۱۳؛ گیلانی، اسعد، '' اقبال، دارالاسلام اور مودودی''، ص ۹۷، مزید ملاحظہ ہو: کے۔ ایم۔ اعظم، "Unforgetable Pakistani"، مشمولہ روزنامہ "The News"، یکم جولائی ۲۰۰۰ء ص ۶۔

(۷۵) مذکورہ امور و مسائل کی بابت محمد اسد کے افکار وخیالات کے لیے دیکھیے: محمد اسد کی تحریروں کے علمی وفکری اثرات و نتائج کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو: ارشد، محمد، ''اسلامی ریاست کی تشکیلِ جدید: نومسلم سکالر محمد اسد کے افکار کا تنقیدی مطالعہ''، لاہور: الفیصل، ۲۰۱۱ء، ابواب: ۵، ۶، ۷؛ وہی مصنف،'' اسلام اور مغرب: نومسلم دانش ور محمد اسد کی نظر میں''، مشمولہ ''فکر ونظر'' (اسلام آباد)، ۴۳: ۴ (اپریل۔ جون ۲۰۰۶ء)، ص ۶۸۔۱۷۔اس ضمن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے خیالات کے لیے ملاحظہ ہو: ہاشمی و خالد (مرتبین)، ''خطوط مودودی''، بمواضع کثیرہ؛ حجازی (مرتب)،''دارالاسلام''۔ روایتی اسلامی نظام تعلیم اور مسلم جامعات میں رائج جدید نظام تعلیم کی اصلاح اور جدید مسلم نوجوان نسل کی مؤثر دینی تعلیم وتربیت کے بارے میں سید مودودی کے افکار وخیالات کا جامع طور سے اظہار ان تحریروں میں ہوا ہے جو انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دینیات اور علوم اسلامیہ کے ناقص طرز تعلیم کی اصلاح کی غرض سے تیار کرکے اس یونیورسٹی کے کار پردازوں کو ارسال کی تھیں، دیکھیے: مودودی، سید ابوالاعلیٰ،''اشارات''، مشمولہ ''ترجمان القرآن''، ۸: ۵ (جمادی الاوّلی ۱۳۵۵ھ)، ص ۲-۱۳؛''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اسلامی تعلیم''، مشمولہ '' ترجمان القرآن''، ۸: ۶ (جمادی الآخری، ۱۳۵۵ھ)، ص ۵۰-۷۴۔ سید مودودی کی یہ دونوں تحریریں تعلیمی مسائل سے متعلق ان کے مجموعۂ مضامین '' تعلیمات''، (مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۲ء)، میں شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبال کے خیالات کے بارے میں ملاحظہ ہو: عبدالواحد، سیّد (مرتب)، "Thoughts and Reflections of Iqbal"، ص ۱۰۳-۱۰۹۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆